• جون ۱۹۸۷ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
حِکَم و عِبَر (ہدایت قرآنی کے چار پہلو اور قرآن کالج کا منصوبہ)	ڈاکٹر اسرار احمد	۳
ہدایۃ القرآن (۱۵)	مولانا محمد تقی امینی	۲۹
اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام	ڈاکٹر اسرار احمد	۳۱
منشورِ اسلام (۴)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین	۵۵
مرکزی انجمن کی سالانہ رپورٹ	لطف الرحمٰن خان	۶۵

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

	اعلیٰ	اشاعتِ عام
مُسلمانوں پر قرآنِ مجید کے حقوق	6.00	2.00
راہِ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں)	5.00	2.00
قرآنِ حکیم کی سُورتوں کا اجمالی تجزیہ	10.00	
مطالعۂ قرآنِ حکیم کا منتخب نصاب	12.00	
قرآن اور امنِ عالم	2.00	
دعوت الی اللہ	2.00	
رسُولِ کامل ﷺ	6.00	
نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت	5.00	3.00
نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	4.00	
معراج النبی ﷺ	3.00	
شہیدِ مظلوم (حضرت عثمان ذوالنورین رضؓ)	3.00	2.00
سانحۂ کربلا (شہادت حسینؓ کا اصل پس منظر)	4.00	2.00
اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام	2.00	
اسلام میں عورت کا مقام	8.00	5.00
عظمتِ صوم	2.00	
عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی	4.00	
اسلام اور پاکستان	5.00	
استحکامِ پاکستان	30.00 20.00	
علّامہ اقبال اور ہم	3.00	
شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک	4.00	
اسلام کا معاشی نظام	6.00	
دعوتِ رجوع الی القرآن		

وَمَن یُؤتَ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیرًا کَثِیرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

مینجنگ ایڈیٹر: اقتدار احمد

جلد ٦ | جون ۱۹۸۷ء مطابق شوال المکرم ۱۴۰۷ھ | شمارہ ٦

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳٦۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۸۵۲٦۱۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱٦۵۸٦

سالانہ زرِ تعاون -/۴۰ روپے فی شمارہ -/۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

عاکف سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

قارئین کے علم میں ہے کہ ماہنامہ 'حکمتِ قرآن' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا ترجمان ہے۔ اس اعتبار سے چاہیئے تو یہ تھا کہ ماہ بماہ انجمن کی سرگرمیوں اور کارکردگی کی تفصیلات کو اس پرچے میں شائع کیا جاتا اور اسے اراکین انجمن سے رابطہ کا ایک مستقل ذریعہ بنایا جاتا۔ لیکن اسے ہماری کوتاہی کہیئے کہ ایسا نہ ہوا۔ تاہم "دیر آید درست آید" سے حوصلہ پکڑتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ سے انجمن کی کارکردگی اور سرگرمیوں کی تفصیلات خصوصاً سالانہ رپورٹ کو باقاعدہ طور پر 'حکمتِ قرآن' میں شائع کیا جائے گا۔ اور انجمن کے اُن تمام اراکین کو جو اپنا زرِ تعاون باقاعدگی سے ادا کر رہے ہیں ہر ماہ اعزازی طور پر 'حکمتِ قرآن' بھیجا جائے گا تاکہ یہ پرچہ نہ صرف یہ کہ وابستگانِ انجمن کے علمی افادے کا ذریعہ بنے بلکہ اضافی طور پر اس کے ذریعے اُن سے مستقل رابطے کی صورت بھی بن جائے۔

زیرِ نظر شمارے سے اس فیصلے پر عملدرآمد کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ یہ شمارہ تمام اراکینِ انجمن کو ارسال کیا جا رہا ہے اور اس میں انجمن کی وہ سالانہ رپورٹ بھی شامل ہے جو امسال انجمن کے سالانہ اجتماع کے موقع پر پیش کی گئی تھی۔

حکم و عبر

ہدایتِ قرآنی کے چار پہلو

دعوتِ رجوع الی القرآن کے وسیع تر تناظر میں

قرآن کالج کا منصوبہ

"انسانم آرزوست"

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب
مرتب: مقبول الرحیم مفتی

جمعہ دس رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ مطابق ۸ مئی ۱۹۸۷ء کو امیر تنظیم اسلامی و صدر موسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے جامع دارالسلام باغ جناح لاہور میں خطاب جمعہ کے دوران انجمن کے نئے تعلیمی منصوبے "قرآن کالج" کی تفصیلات اور ضروریات پر روشنی ڈالتے ہوئے اہل لاہور سے بالخصوص اور اہل پاکستان سے بالعموم "انسانم آرزوست" کی پرزور اپیل کی تھی' اور مالی امداد و اعانت سے بڑھ کر قرآن کالج کے لئے اپنی اولاد کو اس ادارے میں حصول تعلیم کے لئے داخل کرانے پر زور دیا تھا تاکہ اس مقصد کی طرف حقیقی پیش رفت ممکن ہو سکے جس کے لئے یہ ادارہ قائم کیا جا رہا ہے۔ زیر نظر تحریر میں ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب اور اس سلسلے کی گذشتہ تحریروں یعنی "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" "اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام" "سرانگندیم" اور "دعوت و رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" سے استفادہ کیا گیا ہے' اور اس میں ڈاکٹر صاحب کے ۲۳ مارچ کے اس خطاب کے مشمولات کو سمونے کی کوشش بھی کی گئی ہے جسے ٹیپ میں محفوظ نہ کیا جا سکا تھا اور مئی کے "حرف اول" میں اسے ضبط تحریر میں لانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

حضرات گرامی رمضان کی فضیلت اور بزرگی کا سبب اس ماہ مبارک میں قرآن کا نزول ہے۔ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ ہے کہ امت کے لئے یہ مہینہ قرآن کے ساتھ خصوصی تعلق کا مہینہ بن جائے۔ لیکن حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ ہر سال رمضان آتا ہے اور گذر جاتا ہے لیکن ہم اس کی برکات سے محروم رہتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا مذہبی طبقہ بھی تبرک کی حد تک تراویح میں سماعت قرآن یا انفرادی طور پر تلاوت قرآن سے بڑھ کر اس پیغام ہدایت کو سمجھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کرتا۔ حالانکہ ہماری دینوی اور اخروی فلاح و کامیابی کی واحد صورت یہی ہے کہ ہم ایک بار پھر انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس سرچشمۂ فیض وہدایت کی طرف لوٹیں جس کی اطاعت وپیروی نے ہمیں انسانیت کا امام بنایا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں کئی مقامات پر اس سرچشمۂ رشدوہدایت کی تعریف کے لئے مختلف انداز اور اسالیب اختیار کئے ہیں اور جابجا اس سے ہدایت ورہنمائی حاصل کرنے کی شرائط بیان کی ہیں۔ لیکن انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہماری بدقسمتی یا کوتاہ ہمتی ہے کہ ہم اس کتاب پر ایمان رکھنے کے باوجود اس کی ہدایت سے محروم ہیں۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ربانی ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ (سورہ البقرہ آیت ۱۸۵)

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لئے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق وباطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔

اس مقام پر قرآن کی تین صفات بیان کی گئی ہیں۔ اول یہ کہ قرآن پوری نوع انسانی کے لئے ہدایت اور رہنمائی ہے دوسری بات یہ کہ اس کی ہدایت بالکل صاف اور واضح ہے اس میں کوئی ابہام اور پیچیدگی نہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے کسی اضافی دلیل کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنی جگہ بیّن واضح روشن اور مکمل ہدایت ہے۔ تیسری بات یہ کہ اس کی ہدایت حق اور باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہے۔ اسی مناسبت سے ہم قرآن مجید کے ساتھ "فرقان حمید" کے الفاظ کا اضافہ بھی کرتے ہیں۔

ہدایت کا مفہوم

عربی زبان میں "ہدایت" ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے۔ ہدایت اس کو بھی کہتے ہیں کہ کسی راستہ پوچھنے والے کو آپ زبانی راستہ سمجھادیں کہ فلاں جگہ سے دائیں مڑنا فلاں مقام سے بائیں مڑنا

وغیرہ۔ جبکہ ہدایت اور رہنمائی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ سائل کے ساتھ چل پڑیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے منزل مقصود تک پہنچا دیں۔ سورہ اعراف میں اہل جنت کا ایک قول نقل ہوا ہے۔ کہ جب وہ جنت میں داخل کیے جائیں گے تو وہ ان الفاظ میں اللہ کی حمد اور بزرگی بیان کریں گے کہ.....

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ (سورہ اعراف آیت ۴۳)

شکر اور تعریف اسی اللہ کے لئے ہی ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا۔ ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے اگر اللہ ہماری رہنمائی نہ کرتا۔

یہاں ہدایت کا لفظ دوسرے اور وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ہم ہر روز نماز میں سورہ فاتحہ پڑھتے ہوئے اللہ سے یہی دعا کرتے ہیں کہ اھدنا الصراط المستقیم (اے اللہ) ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ بلاشبہ ہدایت ہم تک پہنچ تو چکی ہے لیکن ہدایت کی تکمیل تب ہوگی جب اللہ تعالیٰ ہمیں درجہ بدرجہ صراط مستقیم پر چلاتے ہوئے' بالآخر جنت میں داخل کر دیں گے۔ اس فانی زندگی میں ہدایت کی کوئی انتہا نہیں۔ ہر شخص خواہ وہ عالم ہو یا عامی زندگی کے ہر لمحے میں ہدایت کا محتاج ہے۔ مقام نبوت پر فائز ہونے کے باوجود خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر نماز میں یہی دعا فرماتے رہے۔ کسی بڑے سے بڑے عالم متقی اور نیک شخص کا قدم عمر کے کسی بھی مرحلے میں اور کسی وقت بھی پھسل سکتا ہے۔ سورہ اعراف میں ایسے ہی ایک شخص کی مثال بیان کی گئی ہے جس کے بارے میں اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے ایک عام' صاحب تصرف اور مستجاب الدعوات درویش بلعم باعورا کا ذکر ہے جو عورت اور دولت کے لالچ میں آ کر اپنے بلند مقام اور مرتبے سے محروم ہو گیا تھا۔

وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْھَا فَاَتْبَعَہُ الشَّیْطٰنُ فَکَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰہُ بِھَا وَلٰکِنَّہٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ ھَوٰىہُ ۚ (سورہ ۷ اعراف)

(اے محمد) ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے' مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا۔

ایک حدیث میں اسی مفہوم کی تنبیہ ہے کہ ایسا بھی ہوتا ہے ایک شخص نیک اعمال کرتے کرتے جنت کے اتنے قریب پہنچ جاتا ہے کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے لیکن اچانک وہ کوئی ایسا کام کرتا ہے کہ اس کے انجام کا رخ بدل جاتا ہے اور وہ جہنم میں جا گرتا ہے۔ اس لئے مرتے دم تک کوئی فرد بشر ہدایت اور رہنمائی سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

ہدایتِ قرآنی کے چار پہلو

یہ بات سب جانتے ہیں کہ قرآن سراسر ہدایت ہے لیکن غور و فکر کے نتیجے میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قرآن کا ہدایت ہونا چار اعتبارات سے ہے۔

قرآن مجید کی ہدایت کے یہ چار پہلو ہمارے ذہن پر نقش ہونے چاہئیں تاکہ ہمیں اس کی ہمہ گیری آفاقیت اور کاملیت کا بھرپور احساس رہے۔ ایک پہلو یہ ہے کہ یہ ہدایت انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی یعنی ایک شخص کی انفرادی زندگی کے لئے بھی اس میں رہنمائی کا سامان موجود ہے اور اجتماعی زندگی کے پورے نظام کو چلانے اور اس کی پیچیدگیوں کو سلجھانے اور حل کرنے کے لئے بھی ہدایات موجود ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ رہنمائی علمی و فکری بھی ہے اور عملی بھی۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن کی ہدایت اور رہنمائی ایک عام آدمی کے لئے بھی ہے اور ایک عالم کے لئے بھی ہے۔ ایک عام آدمی قرآن کے مطالعے کے دوران محسوس کرتا ہے کہ اس کتاب کا اصل مخاطب ہے ہی وہ۔ اور بڑے سے بڑے عالم اور فلسفی کے لئے بھی اس کی گہرائی میں اتر کر تدبر و تفکر کے پورے مواقع موجود ہیں۔ ہمارے عہد میں علامہ اقبال کی ذات میں اس کی بہترین مثال موجود ہے۔ انہوں نے اپنے وقت کے اعلیٰ ترین معیار پر جدید فلسفہ و حکمت کی تعلیم حاصل کی اور تہذیب جدید کے مراکز میں رہ کر اس کو دیکھا اور پرکھا۔ اس تجربے اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ انہوں نے قرآن پر غور و فکر اور تدبر کے ذریعے اس کتاب ہدایت کی گہرائیوں میں اتر کر اس کی حکمتوں کو سمجھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس عہد کے انسان کی مشکلات کا حل اسی کتاب ہدایت کی پیروی میں پوشیدہ ہے۔ اور امت مسلمہ انسانیت کی امامت و رہنمائی کا کھویا ہوا مقام بھی اس کتاب ہدایت کی کامل اتباع و پیروی کے ذریعے ہی حاصل کر سکتی ہے۔ اس ہدایت کا چوتھا اور اہم ترین پہلو یہ ہے کہ جس طرح آج سے چودہ سو برس قبل اپنے نزول کے وقت یہ ہدایت کار آمد تھی اسی طرح آج بھی ہے اور رہتی دنیا تک امن و سکون اور راحت جسم و جاں کی ضمانت اسی کی اتباع اور پیروی سے ملے گی۔ انسانی علم و فکر جتنی بھی ترقی کر جائے اسے مکمل رہنمائی کا سامان اس قرآن مجید میں ہی ملے گا۔

قرآن فہمی کے دو درجے

قرآن کی ہدایت کے تیسرے پہلو میں ہم بیان کر آئے ہیں یہ کتاب جس طرح ایک عام آدمی کے لئے ہدایت کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے اسی طرح بڑے سے بڑے عالم اور فلسفی کے لئے بھی اس کے اندر رہنمائی موجود ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کو سمجھنے اور اس پر غور و فکر کرنے کے بھی دو درجے متعین ہوتے ہیں۔ جنہیں خود قرآن نے تذکر اور تدبر کے عنوان عطا کئے ہیں۔

تذکر بالقرآن

تذکر کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کو انتہائی آسان بنا دیا ہے۔ اس کیلئے صرف دو شرطیں ہیں اول نیت کا درست ہونا دوم عربی زبان کا فہم سورہ قمر میں یہ آیت چار مرتبہ دہرائی گئی ہے کہ۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ	اور ہم نے قرآن کو آسان کر دیا سمجھنے
فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝	کے لئے پھر ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا

اگر قرآن کی زبان میں سادگی بے ساختگی اور تفہیم کی وہ کیفیت نہ ہوتی جسے عربی میں "تیسیر" کہتے ہیں تو عامی انسان اس سے کیسے فائدہ اٹھاتا۔ اس کی تذکیر تک اسے کیسے رسائی حاصل ہوتی! قرآن کی زبان انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔ یہ سہل ممتنع کا بے مثال نمونہ ہے..... ایسا سادہ اور عام فہم نمونہ جو بظاہر تو بہت آسان دکھائی دے لیکن جب آدمی اس انداز سے بات کہنے کی کوشش کرے تو کہہ نہ سکے..... لیکن اس تیسیر اور تذکیر سے فیض یاب ہونے کے لئے کم از کم اتنی عربی سیکھنا لازم ہے کہ آدمی ترجمے کی مدد کے بغیر قرآن کے مفہوم کو سمجھ سکے۔ اس کے بغیر تلاوت کا ثواب تو حاصل کیا جا سکتا ہے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے متن سے نظر ہٹا کر بار بار ترجمہ دیکھنے سے قرآن کی وہ تاثیر ختم ہو جاتی ہے جو انسان کے ضمیر اور روح کو متاثر کرتی ہے اسی کیفیت کو علامہ اقبال نے اپنے شعر میں بیان کیا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

عام تعلیم، ہدایت اور رہنمائی کے اعتبار سے قرآن نہایت کھلا ہوا اور آسان ہے۔ ہر شخص بقدر

استعداد اس سے فیض حاصل کر سکتا ہے۔ زندگی کو جس روش پر گذارنا چاہئے اس کی طرف یہ پہلی نظر میں 'اشارہ کر دیتا ہے۔

تدبّرِ قرآن

قرآن فہمی کا دوسرا درجہ تدبر قرآن ہے۔ قرآن کے عمیق فلسفے اور گہری حکمت تک پہنچنے کے لئے تدبر کی ضرورت ہے اس کے لئے محض عربی دانی کافی نہیں۔ قرآن کی گہرائی اتھاہ اور اس کی وسعت ناپیدا کنار ہے اس کے لئے صرف پیرنا ہی کافی نہیں ڈوبنا بھی پڑتا ہے۔ یہ پیہم مطالعہ اور مسلسل غور و فکر کی چیز ہے اس کے لئے زندگیاں وقف کرنی پڑتی ہیں۔ صحابہ کرام کو نہ تو قرآن کی زبان سیکھنی تھی نہ عقائد اور فلسفے کی بحثوں سے وہ آشنا تھے۔ زبان ان کی تھی' محاورہ ان کا تھا' حالات و معاملات اور عقائد و اعمال سب ان کے تھے لیکن ایک ایک سورہ پر آٹھ آٹھ سال تدبر اور غور و فکر اور تدبر و تفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ ہر قدم پر لعلکم تعقلون (تاکہ تم سمجھو) ہر چند آیات کے بعد لعلکم تتفکرون (تاکہ تم غور کرو) ہر تھوڑے تھوڑے فاصلہ کے بعد لعلکم تذکرون (تاکہ یاد دہانی حاصل کرو) کی دعوت بلند ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کے اسرار و حقائق پر غور کرنے کے لئے ان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حلقے قائم تھے' جو تدبّر کا ذوق رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے حلقوں کے قیام کے لئے موثر الفاظ میں لوگوں کو شوق دلایا کرتے تھے ابو داؤد میں روایت ہے۔

مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ وَ یَتَدَارَسُوْنَہٗ بَیْنَھُمْ اِلَّا نُزِلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ وَ غَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ وَ حَفَّتْھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَ ذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْمَنْ عِنْدَہٗ

جو لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر اللہ کی کتاب پڑھتے اور باہم درس و مذاکرہ قرآن کی مجلسیں قائم کرتے ہیں ان پر اللہ کی طرف سے تسکین اور رحمت کی بارش نازل ہوتی ہے اور ملائکہ ان کو ہر طرف سے گھیرے کھڑے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کے حلقے میں ان کا ذکر فرماتا ہے۔

تمام آنے والے ادوار کے لئے تمدن کے پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہونے والے مسائل کا حل قرآن کے اندر موجود ہے لیکن اس تک پہنچنے کے لئے قرآن کے بحر ذخار میں غوطہ زنی کرنی پڑے گی مگر

اس کام کی شرائط بڑی کڑی ہیں۔ اس کے لئے عربیت کے اعلیٰ ذوق کے ساتھ اپنی ذہنی استعداد کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ عہد جدید کے مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لئے پہلے مسائل سے آگاہی حاصل کرنی پڑے گی۔ اپنے ذہنی افق کو وسیع کرنے کے لئے جدید دور کے علوم و مسائل میں مہارت پیدا کرنی پڑے گی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ سمندر سے آپ اتنا ہی پانی لے سکتے ہیں جتنا آپ کے پاس برتن ہے۔ بالکل اسی طرح قرآن علم و حکمت کا ایک اتھاہ سمندر ہے لیکن آپ اس سے اپنے ذہن کی وسعت کے مطابق ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اگر ذہن کے اندر مسائل کا ادراک ہی نہیں، غور و فکر کی تربیت ہی نہیں اس نے خرد کی گتھیاں سلجھائی ہی نہیں اسے معلوم ہی نہیں کہ معاشیات کے مسائل کیا ہیں سیاسیات کے تقاضے کیا ہیں، جدید ریاست میں دستور و قانون کی کیا اہمیت ہے تو اسے قرآن سے کیا ملے گا۔ اس مناظر میں دیکھیں تو تدبر قرآن کا عمل ایک مسلسل عمل ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہمارے زوال کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے تاریخ کے ایک مرحلے میں قرآن پر تدبر کرنا چھوڑ دیا۔ ہماری مجموعی فکر جامد ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں ہمارے زوال کا آغاز ہوا جو آج اپنے عروج پر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے یورپ کو ہوشیار کر دیا اور تدبر و تفکر کی راہیں انہیں دکھا دیں۔ وہ جاگ گئے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ ان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہی تنزل شروع ہوا۔ قدرت کے کارخانے میں سکون محال ہے اگر آپ آگے نہیں بڑھیں گے تو کسی مقام پر ٹھہر نہیں سکتے پھر آپ کے پیچھے ہٹنے کا عمل شروع ہو جائے گا۔ اس ترقی معکوس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم پیچھے ہٹتے ہٹتے اتنے پیچھے ہٹے کہ یورپ کے غلام بن گئے۔ سیاسی غلامی کے ساتھ ذہنی اور فکری غلامی کا آنا فطری امر ہے۔ آج کیفیت یہ ہے کہ ہم ہر میدان میں یورپ کے بھکاری ہیں۔ آج ہمارے نزدیک علم ہے تو یورپ کا، اقدار ہیں تو یورپ کی، تہذیب قابل تقلید ہے تو یورپ کی۔ ہماری اسی ذہنی فکری سیاسی اور تمدنی غلامی کے اثرات کا نتیجہ آج سے ستر، اسی برس قبل اکبر الہ آبادی مرحوم نے بڑے خوبصورت انداز میں ایک شعر میں بیان کر دیا تھا کہ ؎

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیئر[1] میں چھپے

---

[1] اس دور کا ایک انگریزی اخبار

تذکرو تدبّرِ قرآن کی مختصر تاریخ

حضرات گرامی مرکزی انجمن خدام القرآن اور اس کے بانی کی تمام تر مساعی کا محور و مقصد درحقیقت قرآن کی اسی ہدایت کو عام کرنا اور دعوت رجوع الی القرآن کے کام کو امت میں فروغ دینا اور اس کے لئے اپنی ساری توانائیوں اور صلاحیتوں کو کھپا دینا ہے۔ تنظیم اسلامی کی صورت میں حکم بالقرآن یعنی شہادت حق اور اقامت دین کے لئے جدوجہد کا آغاز بھی آپ کے سامنے ہے۔ اگرچہ ہماری تنظیم ابھی دعوت و تنظیم اور تربیت و تزکیہ کے بالکل ابتدائی مراحل میں ہے۔ لیکن اس سے ایک بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ ہمارے لئے قرآن کا فکر اور پیغام محض ایک علمی اور فکری شے نہیں بلکہ اس کے نفاذ کی جدوجہد ہماری زندگی کا سب سے اہم اور عملی مسئلہ بھی ہے۔ اپنی ذات اور انجمن کے حوالے سے فہم قرآن اور رجوع الی القرآن کے سلسلے میں انجام دی گئی خدمت اور مستقبل کے منصوبوں اور ارادوں کا بیان کرنے سے پہلے گذشتہ دو سو برس میں برصغیر پاک و ہند میں اس کام کی تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ کو اس کام کی نوعیت و اہمیت اور اس کی ضرورت و مشکلات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ اس ضمن میں ایک بات ضرور پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس جائزے میں بیسوی صدی کی ان نمایاں اور منفرد کوششوں کا تذکرہ ہے جن پر بحیثیت مجموعی فکر مغرب سے مرعوبیت اور تجدید پسندی کے اس عنصر کا غلبہ نہیں جس کے علمبردار سرسید احمد خان مرحوم تھے۔

فکر ولی اللّٰہی

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے آخری زمانے میں جب یہاں انگریزی اقتدار کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں، امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اس سرزمین میں بسنے والی امت مسلمہ کا تعلق اللہ کی آخری کتاب ہدایت، قرآن مجید، فرقان حمید سے جوڑنے کی عظیم کوشش کا آغاز قرآن مجید کے فارسی ترجمے اور اصول تفسیر کے منفرد رسالے "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" کی تالیف سے کیا۔ شاہ صاحب کے کام کو ان کے دو صاحبزادوں شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے علی الترتیب قرآن کے لفظی اور بامحاورہ اردو ترجموں کے ذریعے آگے بڑھایا۔ اسلامیان ہند کے سیاسی اور عمرانی وجود کے تحفظ اور احیاء دین کے سلسلے میں شاہ صاحب کی علمی اور عملی خدمات اپنی جگہ عظیم الشان اور ہمہ گیر ہیں۔ یہاں صرف موضوع کی مناسبت سے ان

کے عظیم ترین کارنامے یعنی "رجوع الی القرآن" کی راہیں کھولنے کے کام کا ذکر کیا گیا ہے۔

سیاسی اعتبار سے انیسویں صدی کا زمانہ برصغیر کے باشندوں کے لئے مجموعی اعتبار سے بدامنی افراتفری اور سیاسی شکست و ریخت کا زمانہ تھا لیکن اقتدار سے محروم کئے جانے والے طبقے کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے تو اس کے مصائب و شدائد دیگر اقوام ہند سے کئی گنا زیادہ تھے۔ اسی زمانے میں مسلمانوں نے چراغ سحری کی آخری بھڑک کی مانند ہندوستان میں اپنے اقتدار کو بچانے کی دو ناکام کوششیں کیں۔ پہلی کوشش یعنی ۱۸۳۱ء کی تحریک مجاہدین 'اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک خالص دینی اور نظریاتی تحریک تھی اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی فکری مساعی کا عملی نتیجہ تھی۔ اس کا مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کی بحالی کے ساتھ ساتھ ایک خالص اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ اس تحریک کا اصل زور تو معرکہ بالاکوٹ میں سکھوں کے مقابلے میں شکست اور تحریک کے قائدین شاہ اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ اور سید احمد بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کی شہادت کے ساتھ ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن "جہاد بالسیف" کی جو روح اس تحریک نے علماء ربانی میں پیدا کر دی تھی وہ بیسویں صدی کے ربع اول تک عملاً باقی رہی۔ ہجرت افغانستان اور پڑوسی مسلمان ریاستوں کی عسکری مدد سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی "تحریک ریشمی رومال" درحقیقت فکر ولی اللہی اور تحریک مجاہدین کا ہی ایک تسلسل تھی۔ دوسری اور آخری کوشش یعنی ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی اگرچہ اپنے مزاج کے اعتبار سے آزادی ہند کی ایک قومی تحریک تھی جس میں ہندوستان کی ساری قومیں شریک تھیں لیکن فطری طور پر اس کی قیادت بالعموم مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور بحیثیت مجموعی اسے ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی آخری ہچکی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس جنگ میں بھی علماء کرام نے بھرپور انداز میں شرکت کی تھی لیکن یہ جنگ تحریک مجاہدین کے جہاد کی طرح کی نظریاتی جنگ نہ تھی۔ بہرحال ان دو مسلح کوششوں کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے رسمی اور کلی خاتمے کے ساتھ ہی ہندوؤں اور عیسائیوں کی طرف سے نظریاتی حملوں کا آغاز بھی ہوا۔ علماء کرام نے دونوں محاذوں پر امت کے ایمان اور مذہبی اقدار کو بچانے میں اپنا کردار بطریق احسن ادا کیا۔

دیوبند

سیاسی بدامنی 'جنگ و جدل اور مذہبی محاذ پر عیسائی اور ہندو مبلغین کے مقابلے میں مصروفیت کی وجہ سے انیسویں صدی کے آخر تک اگرچہ قرآن فہمی کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر علمی پیش رفت نظر نہیں آتی 'لیکن دارالعلوم دیوبند اور دیگر کئی علمی مراکز کے قیام کی صورت میں علمی میدان میں پیش رفت کی بنیادیں جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انتہائی نامساعد حالات میں ہی رکھ دی گئی تھیں جن

کے نتائج بیسویں صدی کے اوائل میں نکلنا شروع ہوئے۔ "تحریک ریشمی رومال" کے قائد اور روح رواں امام الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ جو پہلی جنگ عظیم کے دوران جزائر انڈیمان میں قید تھے نے ایام اسیری میں ہی شاہ عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہ کے اولین بامحاورہ اردو ترجمے موضح القرآن پر نظر ثانی کا کام مکمل کیا جو ان کی رہائی کے بعد ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ موضح الفرقان کے نام سے شائع ہوا۔ اسی زمانے میں دیوبندی مکتب فکر کے دوسرے بڑے عالم حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی تفسیر بیان القرآن بھی منظر عام پر آئی جس نے جدید و قدیم دونوں طبقوں میں مقبولیت پائی۔ اس کے ذریعے خود مصنف کی نگرانی میں فہم قرآن کا ایک وسیع حلقہ متحدہ ہندوستان کے طول و عرض میں وجود میں آیا جس کی اہم خصوصیت فہم قرآن کے ساتھ ساتھ تربیت و تزکیہ کے میدان میں عملی رہنمائی کا اہتمام تھا۔ دیوبندی مکتب فکر کی ان دو بڑی شخصیتوں کی خدمت قرآن کے ساتھ اس دور میں اسی مکتب فکر کے علماء میں سے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا فتح محمد جالندھری کے اردو تراجم بھی شائع ہوئے اور عوام میں انہیں قبول عام حاصل ہوا۔

ابوالکلام آزادؒ اور ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اب تک "رجوع الی القرآن" کی جن کوششوں کا ذکر ہو چکا ہے ان میں تذکیر کا رنگ نمایاں تھا۔ اور عوام میں ان کے محسوس اثرات و نتائج بھی افراد کی انفرادی اصلاح اور تزکیہ نفس کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ درحقیقت رجوع الی القرآن کے اس بنیادی کام نے عوامی سطح پر اقامت دین اور تدبر قرآن کے اس کام کے لئے میدان ہموار کیا جس کا ذکر ہم آئندہ سطور میں کرنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں بیسویں صدی کی چار نابغہ عصر شخصیات کی فکری و عملی خدمات بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ سب سے پہلی شخصیت کو ہم امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مدیر الہلال والبلاغ اور قرآن کی انقلابی فکر کے مبلغ و مفسر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا جس کا مقصد وحید مسلم امت کو قرآن کی طرف متوجہ کرنا اور ان میں جہاد کی روح بیدار کرنا تھا۔ اسی رسالے کے ذریعے انہوں نے حکومت الٰہیہ کا تصور پیش کیا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی روایت کے مطابق حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ "الہلال" کا گہرا مطالعہ کیا کرتے تھے حالانکہ اس میں تصویریں بھی شائع ہوتی تھیں اور یہ امر ان کے بعض ساتھی علماء کرام کے لئے باعث اعتراض تھا۔ لیکن حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ نے اس اعتراض کے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ مولانا آزادؒ اور مولانا محمود حسنؒ کی فکری اور ذہنی ہم آہنگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اعتراض سن کر "حضرت شیخ الہندؒ نے پہلے تو یہ شعر پڑھا۔

کامل اس طبقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

پھر فرمایا کہ میاں تم اس بات کو دیکھتے ہو کہ اس میں تصویریں ہوتی ہیں' تم یہ بات نہیں دیکھتے کہ وہ فریضہ جہاد جس سے ہم سب لوگ غافل تھے اس کو سب سے پہلے جس شخص نے یاد دلایا وہ یہی ابوالکلام آزاد ہیں' لہٰذا ہم ان کے نہایت شکر گذار ہیں۔ حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے منظم جدوجہد کرنے کے لئے مولانا آزاد نے "حزب اللہ" کے نام سے ایک جماعت کی تشکیل کا آغاز بھی کیا تھا۔ لیکن طبقہ علماء کی طرف سے بھرپور تعاون اور ان کی قیادت کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے انہوں نے اس کام کو آگے نہ بڑھایا اور انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہو کر "حکومت الٰہیہ" کے قیام جیسے مثالی' صبر آزما اور عظیم تر مقصد کی بجائے آزادی وطن اور ہندو مسلم اتحاد جیسے عملی فوری اور نتیجہ خیز مقاصد کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ لیکن انہوں نے جس زوردار اور پرجوش انداز سے تحریر و تقریر میں اپنی بے مثال صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی تفسیر قرآن "ترجمان القرآن" اور الہلال والبلاغ کے پر اثر مقالات و مضامین کے ذریعے اسلامیان ہند کے قلب و ذہن میں رجوع الی القرآن اور اقامت دین کے تصورات کے بیج بوئے وہ تناور درختوں کی صورت میں آج پاک و ہند کے مسلم معاشروں میں موجود ہیں۔ مولانا آزاد کے حکومت الٰہیہ کے تصور اور اس کے لئے منظم جدوجہد کے انقلابی تصور کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے ۱۹۳۰ء میں اپنے رسالہ ترجمان القرآن کے مضامین کے ذریعے آگے بڑھایا اور پھر دس سالہ فکری اور دعوتی کام کی بنیاد پر ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی' قائم کر کے عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ مولانا آزاد کی طرح مولانا مودودی مرحوم نے بھی اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" میں اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" کی اشاعت کا آغاز کیا۔ جس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ اولاً اس میں اقامت دین کی جدوجہد' جماعت کی تنظیم و تربیت کے پہلو سے قرآن کی تشریح و تفہیم کی گئی ہے اور ثانیاً عہد جدید کے مسائل و معاملات کا حل بھی قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ "تفہیم القرآن" دعوت و تذکیر اور تدبر دونوں پہلوؤں سے فہم قرآن کی ایک عمدہ اور اثر آفریں کوشش ہے۔ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی دلی کی ٹکسالی زبان نے اس کی اثر آفرینی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ نسل میں تفہیم القرآن کی مقبولیت کا واحد سبب یہی ہے کہ عہد حاضر کے مسائل کا قرآنی حل عہد حاضر کی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ جس طرح مولانا آزاد اپنی زندگی کے ایک مرحلے میں' آزادی وطن کی خاطر ہندوستان کی قومی سیاست کے علمبردار بن گئے تھے اسی طرح مولانا

مودودی مرحوم بھی قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی قومی سیاست اور انتخابات میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ ان کی تحریک اسلامی کا انقلابی رخ بہت حد تک دھیما اور مدھم پڑ گیا اور ان کی " جماعت اسلامی " ایک اصولی اور نظریاتی جماعت کے بجائے ایک قومی سیاسی جماعت میں تبدیل ہو گئی۔ البتہ مولانا مودودی مرحوم کو مولانا آزاد پر یہ فوقیت ضرور حاصل ہے کہ انہوں نے "تفہیم القرآن" کے نام سے خدمت قرآن کے جس کام کا آغاز کیا تھا اللہ نے انہیں اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی سعادت عطا فرمائی۔

جماعت اسلامی کی طرح تبلیغی جماعت کا انداز و طریق بھی مولانا آزاد کی " حزب اللہ " کی ایک ذیلی جماعت " السائحون " کا ٹھیک ٹھیک عکس ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تبلیغی جماعت کے بانی حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے اس طرز پر محنت کرنے کا طریقہ مولانا آزاد کی "السائحون" سے ہی اخذ کیا ہو۔ مقصود یہ ہے کہ اس انداز کے کام کا تصور بھی آزادؒ کے ہاں موجود تھا۔ جدید و قدیم دونوں طبقوں میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی فکر اور دین کے ہمہ گیر تصور کو روشناس کرانے میں مولانا آزادؒ کا بہت بڑا حصہ ہے اور اس فکر کی روشنی میں زمانہ جدید کے مسائل کا اسلامی حل پیش کرنے اور پھر اسے ایک غالب اور کارفرما نظام کی صورت میں نافذ کرنے کی عملی جدوجہد کا آغاز جماعت اسلامی بنا کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کیا' یا یوں کہئے کہ مولانا آزاد نے جو خاکہ پیش کیا تھا اسے مولانا مودودی نے ایک مکمل نقشے کی صورت دے کر تعمیر کے عملی کام کا آغاز کیا۔

فہم قرآن کے دوسرے اور اعلیٰ تر درجے یعنی تدبر قرآن کے سلسلے میں اس عہد کی دو عظیم شخصیتیں علامہ حمید الدین فراہیؒ اور علامہ محمد اقبالؒ منفرد مقام اور مرتبے کی حامل ہیں۔ دونوں حضرات نے اپنے اپنے انداز سے تدبر قرآن کے میدان میں جس مجتہدانہ بصیرت کا اظہار کیا ہے اس نے بعد میں آنے والوں کے لئے غور و فکر کی نئی جہتوں کو وا کیا اور وہ ایسے راستوں کی نشاندہی کر گئے جن پر چل کر ہم عہد حاضر کے مسائل اور مغرب کی کارفرما اور غالب فکر اور تہذیب کا مقابلہ و مواجہ کر کے بحیثیت امت سرخرو ہو سکتے ہیں۔

فراہی مکتب فکر

علامہ حمید الدین فراہیؒ جنہیں بلاشبہ تفسیر قرآن کے میدان میں امام کا درجہ حاصل ہے کی ذات اور کارنامے سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ آپ مولانا شبلی نعمانیؒ کے ماموں زاد بھائی اور ان کے شاگرد تھے۔ مولانا شبلی سے کسب فیض کے بعد علامہ فراہی نے وقت کے جن مشہور اساتذہ کے حلقہ

ہائے درس سے استفادہ کیا ان میں مولانا ابو الحسنات لکھنوی فرنگی محلی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری مرحوم کے نام شامل ہیں۔ بیس سال کی عمر میں عربی زبان اور دینی علوم کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد انگریزی اور علوم جدیدہ کی تکمیل کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں دیگر علوم کے ساتھ فلسفہ کے پروفیسر، مشہور انگریز مستشرق ڈاکٹر آرنلڈ سے فلسفہ جدیدہ کی تحصیل کی اور اس میں امتیاز حاصل کیا۔ بی اے کی ڈگری علامہ نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے لی۔ علی گڑھ میں عربی کی پروفیسری کے زمانے میں آپ نے عربی کے مشہور جرمن مستشرق پروفیسر یوسف ہارویز سے عبرانی زبان سیکھی اور اس میں اس حد تک ترقی کر لی کہ عبرانی کتابوں سے براہ راست استفادہ کرنے لگے۔ اور بعد میں اپنی قرآنی تحقیقات میں اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ علامہ حمید الدین فراہی کی قرآنی فکر کو سمجھنے کیلئے اُنکے شاگرد رشید اور ان کی فکر اور فلسفے کے سب سے بڑے مبلغ اور شارح مولانا امین احسن اصلاحی کی ایک تحریر سے ایک قدرے طویل اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے تاکہ قارئین براہ راست مکتب فراہی کے اصول تدبر قرآن اور اس کے پس منظر سے روشناس ہو سکیں مجموعہ تفاسیر فراہی کے صفحہ ۱۴ پر "مصنف کے مختصر حالات زندگی" لکھتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی "تدبر قرآن" کے ذیلی عنوان کے تحت رقم طراز ہیں۔

"یوں تو مولانا فلسفی بھی تھے، متکلم بھی تھے اور عربی اور فارسی کے بے نظیر ادیب اور شاعر بھی تھے لیکن یہ ساری چیزیں مولانا کے ہاں ضمناً تھیں۔ اصلی چیز جو مولانا کے دل و دماغ اور علم و عمل پر حاوی تھی، وہ قرآن تھا۔ قرآن کی ایک ایک آیت بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر انہوں نے اس طرح غور کیا تھا جس طرح اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر غور کرنے کا حق ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لئے انہوں نے نہ صرف قرآن پر غور کرنے کا حق ادا کیا بلکہ ان ساری چیزوں کو بھی نہایت تنقید و تحقیق کی نگاہ سے پڑھا جو قدیم و جدید دونوں راستوں سے ان کو مل سکیں اور جو قرآن کے سمجھنے میں کسی نوعیت سے بھی معین ہو سکتی تھیں۔ کلام عرب کا ہر شعر جو قرآن میں سند کے کام آ سکتا تھا مولانا کی نگاہ میں تھا۔ خطبائے جاہلیت کا ہر خطبہ جو قرآن کے کسی مقام کی تفہیم میں معین ہو سکتا تھا مولانا کے علم میں تھا۔ توریت اور تالمود پر وہ عالمانہ نظر رکھتے تھے اور عبرانی سے واقف ہونے کے سبب سے ان سے براہ راست فائدہ اٹھاتے تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ کے اس سارے حصہ کو وہ اچھی طرح پڑھے ہوئے تھے جس کا کسی نوعیت سے بھی قرآن سے تعلق تھا۔ حدیث اور فقہ کے ذخیرہ کو انہوں نے قرآن کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھا تھا فلسفہ جدید کی ان تمام شاخوں کا بھی انہوں نے نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا، جو قرآن کے اجتماعی و سیاسی اور ما بعد الطبیعی اصولوں کے سمجھنے اور ان کے موازنہ اور مقابلہ میں کار آمد ہو سکتی تھیں۔

مولانا نے قرآن مجید پر غور کرنے کا کام باضابطہ طور پر' جیسا کہ انہوں نے اپنے مقدمہ نظام القرآن میں خود ظاہر فرمایا ہے' اس زمانہ سے شروع کیا ہے جب وہ علی گڑھ میں بحیثیت ایک طالب علم کے مقیم تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سرسید مرحوم مغربی نظریات سے مرعوبیت کے سبب سے قرآن مجید کی من مانی تاویلات کر رہے تھے اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو انگریزوں اور انگریزوں کے لائے ہوئے افکار و نظریات سے مرعوب تھا' بری طرح ان من مانی تاویلات کا شکار ہو رہا تھا۔ مولانا نے اس فتنہ کو جہاں انگریزوں کے تسلط کا ایک قدرتی نتیجہ خیال کیا وہاں اس حقیقت پر بھی ان کی نظر گئی کہ مذہبی علوم خصوصاً قرآن کے سمجھنے سمجھانے کا جو طریقہ مسلمانوں میں رائج اور مقبول رہا ہے وہ بالکل ہی غلط اور فرسودہ ہے۔ اور اس غلط اور فرسودہ طریقہ نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو فکری اعتبار سے اس قدر کمزور اور منفعل بنا دیا ہے کہ وہ بڑی آسانی سے ہر فتنہ کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کا علاج اللہ تعالیٰ نے مولانا کے دل میں یہ ڈالا کہ قرآن مجید پر غور کرنے کا وہ صحیح طریقہ اختیار کیا جائے جس سے حکمت قرآن کے دروازے کھلیں تاکہ مسلمان مغرب کی فاسد عقلیت سے مرعوب ہونے کے بجائے قرآن کی صالح عقلیت سے اس کا مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ مولانا نے تفسیروں کے واسطہ سے قرآن کے سمجھنے کا مقبول عام طریقہ چھوڑ کر قرآن پر براہ راست غور کرنے کا طریقہ اختیار کیا اور آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کی رہنمائی ان اصولوں تک فرمائی جو انہوں نے اپنے مقدمہ نظام القرآن میں بیان فرمائے ہیں اور جن کی وضاحت میں نے اپنی کتاب تدبر قرآن میں کرنے کی کوشش کی ہے۔"

علامہ فراہی کا تعلق ایک خوش حال گھرانے سے تھا اور عمر بھر انہوں نے شعبہ تعلیم میں جن مختلف اداروں میں خدمات سرانجام دیں وہاں ان کا مشاہرہ بھی اپنے عہد کے اعتبار سے انہیں نوابانہ انداز کی زندگی گذارنے کے لئے کافی ہوتا تھا' لیکن انہوں نے ہمیشہ اتباع سنت میں سادہ زندگی اختیار کی اور اپنی دولت کو علم اور اہل علم کی خدمت کے لئے استعمال کیا۔ یوں تو علامہ فراہی اول روز سے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڑھ کے ناظم تھے لیکن اپنی زندگی کے آخری پانچ برسوں میں انہوں نے اپنے وقت اور اپنی محنت کا بڑا حصہ اس مدرسہ کی خدمت پر صرف فرمایا۔ مدرسے کے منتہی طلبہ اور اساتذہ کو قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے محنت شاقہ سے اہل علم کی ایک ایسی ٹیم تیار کی جس نے ان کی فکر اور خدمت کے کام کو آگے بڑھایا۔ مولانا کی تصنیفات اور تالیفات تمام کی تمام عربی زبان میں ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک عوام کی اصلاح کے لئے پہلے علماء کی اصلاح لازم تھی۔ علامہ فراہی کی تعلیمات میں اسلام کی انقلابی فکر اس درجہ راسخ تھی کہ ان کے بیشتر نامور تلامذہ نے مولانا مودودی کی دعوت اقامت دین پر لبیک کہی اور اس تحریک کے لئے بہترین علمی

سرمایہ ثابت ہوئے۔ اس کی سب سے بڑی مثال پاکستان میں ان کے جانشین مولانا امین اصلاحی کی ذات میں موجود ہے۔

علامہ فراہیؒ کے علمی اور فکری جانشین مولانا امین احسن اصلاحی نے نہ صرف اپنے استاد کے طرز فکر اور اصول تفسیر کی روشنی میں "تدبر قرآن" کے نام سے قرآن کی تفسیر لکھی ہے بلکہ اپنے استاد کے طریقے کے مطابق تدبر قرآن کے کام کو اعلیٰ سطح پر آگے بڑھانے کے لئے درس و تدریس کے باقاعدہ حلقوں کا اجراء بھی کیا اور اس پرانہ سالی کے باوصف اپنے سلسلہ دروس کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

علامہ اقبالؒ

میرے نزدیک فہم قرآن کے اس سلسلے کی چوتھی بڑی شخصیت 'علامہ اقبال مرحوم کی ذات ہے ان کی علمی اور عملی خدمات اگرچہ محتاج تعارف نہیں 'لیکن ع 'مرا یاراں غزل خوانے شمردند' کے مصداق ان کی شخصیت کا یہ پہلوان کی شاعری کے نیچے چھپ گیا ہے۔ درحقیقت عوام الناس میں تذکیر بالقرآن اور اعلیٰ فلسفیانہ اور علمی سطح پر تدبر قرآن کے میدان میں علامہ اقبال کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ علامہ اقبال معروف معنوں میں عالم دین نہ تھے اور کسی دارلعلوم یا جامعہ اسلامیہ میں انہوں نے زانوئے تلمذ بھی طے نہ کئے تھے 'اس کے باوجود انہوں نے مغربی تہذیب کے مراکز میں جا کر جدید فلسفے کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور اس تہذیب کی کرشمہ سازیوں کا چشم سر سے مشاہدہ کرنے کے بعد اس سے متاثر ہونے کی بجائے اس کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ مغربی فلسفے اور تہذیب و تمدن کے عمیق مطالعے نے ان پر وحی آسمانی کی رہنمائی سے بے نیاز فکر و فلسفے اور اس پر مبنی طرز حیات کی ہلاکت آفرین 'بے چارگی اور خود فریبی کا راز آشکار کیا تو انہیں امت مسلمہ کی ساری بیماریوں کا حل مغرب کی تقلید کے بجائے آخری کتاب ہدایت کی پیروی میں نظر آیا ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عوام الناس کے لئے عوامی سطح پر اور خواص کے لئے اعلیٰ ترین فکری اور فلسفیانہ سطح پر امت کا رشتہ قرآن سے جوڑنے کی کوشش کی۔ علامہ نے ایک طرف اپنی بھرپور شاعرانہ صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے قرآن کی انقلابی فکر اور اسلام کے درس حریت و مساوات کو مسلم عوام کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا تو دوسری طرف اپنے مشہور خطبات مدراس کے ذریعے اسلامی فکر و فلسفے کی تشکیل جدید اور اسے عصر حاضر کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کے لئے رہنما خطوط کی نشاندہی کی۔ لیکن افسوس کہ علامہ کے بعد ان کی ذات اور ان کی فکر کے بارے میں بلا مبالغہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں

صفحات سیاہ کئے گئے لیکن ان کی فکر کو آگے بڑھانے اور اعلیٰ ترین فکری سطح پر قرآن کی روشنی میں مغرب کے بے خدا فلسفہ و تہذیب کے چیلنج کا جواب دینے کے لئے کوئی بھرپور کام نظر نہیں آتا سوائے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے، جن کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مرحوم کا کام اتنا وقیع ہے کہ اسے فی الواقع فکر اقبال کی تشریح و توضیح کی بجائے تعبیر و توسیع کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اگر زندگی ان سے وفا کرتی تو اس میدان میں ان کے جوہر مزید کھلتے۔ مرحوم نے اپنی تالیف "قرآن اور علم جدید" میں عہد حاضر کے اہم نظریوں اور فلسفوں مثلاً ڈارون کے نظریہ ارتقاء، فرائڈ کے نظریہ جنس، مارکس کے نظریہ جدلی مادیت وغیرہ کا جائزہ قرآن حکیم کی روشنی میں لیا ہے اور ان کے صحیح اور غلط اجزاء کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "آئیڈیالوجی آف فیوچر" نامی تصنیف کے ذریعے علامہ اقبال مرحوم کے فلسفہ خودی کی روشنی میں اسلام کو انسانیت کے مستقبل کے ضامن اور فلاح و بہبود کے امین نظریئے کے طور پر پیش کیا ہے۔

انجمن خدام القرآن اور اُس کا صدر مؤسس

اس مرحلے پر محض تحدیث نعمت کے طور پر میری ذات اور انجمن خدام القرآن کی حقیر خدمات کا ذکر بھی کچھ بیجا اور بے محل نہ ہوگا۔ یہ تذکرہ فخر مباحات اور نام و نمود کے جذبے سے نہیں بلکہ خالصتاً اللہ کے شکر کے اظہار اور اس کے انعامات کے اعتراف و اقرار کے طور پر کیا جا رہا ہے۔ مجھے اپنی خوش بختی پر ناز ہے کہ اوائل جوانی میں ہی ایسے مواقع پیدا ہوگئے کہ قرآن سے ایک ذاتی مناسبت اور قلبی انس کی نعمت میسر آگئی۔ اب تک فکر قرآنی کے جن جدید و قدیم دھاروں کا ذکر آیا ہے۔ ان سب سے میں نے بقدر استطاعت کسب فیض کیا ہے۔ اس کا ذکر میں تفصیل سے اپنے سلسلہ مضامین "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں "مرکزی انجمن خدام القرآن کا موسس اور اس کے فکری رشتے" کے عنوان سے کر چکا ہوں۔ اور یہ مضمون گزشتہ ماہ کے "حکمت قرآن" میں دوبارہ بھی چھپ چکا ہے۔

قرآن کو سمجھنے کے ساتھ سمجھانے کے کام کی توفیق اور مواقع بھی طالب علمی کے زمانے ہی سے میسر آگئے تھے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کی نظامت کے زمانے میں بھی "مطالعہ قرآن" پیش کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ہی رہتی تھی اور تعطیلات کے زمانے میں جب میں لاہور سے ساہیوال آتا تھا تو جماعت اسلامی کے اجتماعات میں درس قرآن کی فرمائش بھی مجھ ہی سے کی جاتی تھی۔ جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد بھی قرآن کو سمجھنے سمجھانے کا سلسلہ کچھ باقاعدگی اور کچھ بے قاعدگی سے

جاری رہا۔ الحمدللہ ۶۶ء سے لیکر (کہ جب سے میں نے لاہور میں مستقل سکونت اختیار کی ہے) اب تک درس قرآن کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہے۔ قیام لاہور کے ابتدائی پانچ سالوں میں تو میں درس قرآن کے ساتھ ساتھ مطب اور مکتبے کی سرگرمیوں کو بھی نباہنے کی کوشش کرتا رہا کہ بقول حسرت

ع ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی

لیکن ۷۲ء سے انجمن خدام القرآن کی تشکیل کے ساتھ ہی جب اللہ نے مجھے فکر معاش سے مستغنی کر دیا تو میں نے اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت قرآن کے پیغام کی اشاعت و اقامت کے لئے وقف کر دیا۔ انجمن کے پیش نظر پروگرام کے پہلے جزو یعنی "قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے اور اعلیٰ علمی سطح پر تشہیر و اشاعت" کی تکمیل کے لئے لاہور کراچی حیدر آباد سکھر راولپنڈی 'پشاور اور کوئٹہ میں وقتاً فوقتاً دروس قرآن کے سلسلے جاری رہے اور دعوتی نقطۂ نظر سے مرتب کردہ مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کا درس میں نے کم و بیش بیسیوں نہیں سینکڑوں بار پاکستان کے مختلف شہروں میں دیا ہے جو اس تحریک رجوع الی القرآن کی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دوران میں محض اللہ کے فضل سے ریڈیو اور ٹیلیویژن جیسے وسیع الاثر ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی فکر قرآنی کی اشاعت کی صورتیں نکلتی رہیں۔ رمضان ۱۳۹۷ ھجری میں ریڈیو پاکستان کی دعوت پر سورہ فاتحہ سے سورہ کہف تک قرآن کی سورتوں کے مضامین کا خلاصہ بیان کرنے کا موقع ملا جو اب "قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی جائزہ" کے نام سے کتابی شکل میں موجود ہے۔ پھر ٹیلیویژن پر کم و بیش ساڑھے تین برس تک الکتاب الم اور الھدیٰ کے ناموں سے درس قرآن کے پروگرام یکے بعد دیگرے چلتے رہے اور اب اللہ کے فضل سے میرے ساتھ قرآن اکیڈمی سے پڑھ کر نکلنے والے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک ٹیم بھی..... قرآن کے پیغام کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہے۔ گویا ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اس کے ساتھ میرے دروس قرآن اور تقاریر کے سمعی اور بصری کیسٹس ——— کے ذریعے دنیا بھر میں جہاں جہاں اردو بولنے اور سمجھنے والے مسلمان بستے ہیں قرآن کا پیغام پھیل رہا ہے۔ یہ ایسا سلسلہ ہے جس کے وسیع اور ہمہ گیر اثرات کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے ان سارے کاموں میں جو کچھ بھی بھلائی اور خیر ہے وہ سراسر اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید کا نتیجہ ہے اور اگر کوئی خامی یا کوتاہی اور غلطی ہے تو وہ میری طرف سے ہے۔ قصہ مختصر یہ

اداروں کی ضرورت اور تشکیل و تعمیر

ہندوستان پر انگریز کے کامل غلبے اور تسلط کے بعد غلبہ دین اور احیائے دین کی ضرورت اور آپ مسلمانوں کے قدیم مذہبی حلقوں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں یکساں طور پر پیدا ہوئی۔ لیکن جب بھی اس سلسلے میں کام کا آغاز کیا گیا تو ایسے جامع الصفات افراد کار کی کمی شدت سے محسوس کی گئی جو دینی علوم کے ساتھ ساتھ زمانہ حال کے علوم اور مسائل کی معرفت بھی یکساں طور پر رکھتے ہوں برصغیر میں اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بہت سے علمی ادارے تشکیل دیئے گئے۔ جامعہ ملیہ، مدرسۃ الاصلاح، ندوہ اور بہت سے دوسرے ادارے اسی نوع کی کوششوں کے نتیجے میں وجود میں آئے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں یہی مقصد حاصل کرنے کے لئے دیوبند اور علی گڑھ کے ذہین اور منتخب فارغ التحصیل طلبہ کے تبادلے کا پروگرام بھی بنا لیکن غالباً ان کی وفات کے بعد سیاسی مسائل و مصروفیات اور مصلحتوں نے ذمہ دار حضرات کو اس قسم کے کاموں کے لئے فرصت ہی نہ دی مدرسۃ الاصلاح اور ندوہ نے بلاشبہ ایسے رجال کار کی کھیپ پیدا کی جو آج بھی علمی میدان میں سرگرم عمل ہیں اور متقدمین کی خدمت کر رہے ہیں لیکن جس بڑے پیمانے اور جس علمی اور فکری سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے اس کے شایان شان پیش قدمی آج تک نہیں ہو سکی۔

دارالارشاد اور دارالاسلام

اس جگہ دو ایسے اداروں کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا جن کا نقشہ دعوت و رجوع الی القرآن کا کام کرنے والی اہم شخصیتوں کے ذہن میں ابھرا لیکن وہ بوجوہ مملا ان اداروں کو قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہماری مراد ابوالکلام آزاد کے "دارالارشاد" اور علامہ اقبال اور مولانا مودودی کے "دارالاسلام" سے ہے "دارالارشاد" کے بارے میں مولانا آزاد کی درج ذیل تحریر ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ کے "البلاغ" میں ملتی ہے۔

> "چند سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ مشیت الٰہی نے اس عاجز کی رہنمائی کی اور الہلال' نے قرآن حکیم کی تبلیغ و دعوت کی صدا از سر نو بلند کی۔ لیکن اس عرصہ میں جو کچھ ہوا وہ ایک دعوت عام تھی جس کے ذریعے فہم و بصیرت قرآنی کی نئی راہیں عوام و خواص نے اپنے سامنے دیکھیں اور قرآن کریم کی عشق و شیفتگی کا

ایک نیا ولولہ دلوں میں پیدا ہو گیا تاہم اس دعوت کی دوسری منزل ابھی باقی ہے اور وہی فی الحقیقت اہم تر مقام سعی و تعب ہے۔ یعنی قوم میں بکثرت ایسے افراد پیدا کئے جائیں جو انہی راہوں پر چل کر قرآن حکیم کے علوم و معارف کو بہ تکمیل حاصل کریں اور ان کے ذریعے قوم میں ارشاد و ہدایت اور احیائے دعوت و ذکر کا عمل بسلسلہ بالعموم شروع ہو سکے۔ "دارالارشاد" کا مقصد یہی ہے کہ دعوت رجوع الی القرآن کی اس دوسری منزل کا سرو سامان ہو اور تھوڑے وقت اور بہت زیادہ صرف علم و فکر سے ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو قرآن حکیم کی دعوت و تبلیغ کی خدمت اور اصلاح و ارشاد امت کا فرض انجام دے سکے۔

معلوم نہیں مولانا آزاد نے اس ادارے کے قیام کے لئے کوئی عملی قدم بھی اٹھایا یا نہیں اور اگر واقعتاً کوئی ادارہ وجود میں آیا تو وہ کتنے عرصے قائم رہا گمان غالب یہی ہے کہ رانچی میں مولانا آزاد کی نظر بندی اور پھر بعد کی سیاسی مصروفیات نے انہیں ان خطوط پر کام آگے بڑھانے کی مہلت ہی نہ دی اسی طرح کی ایک سکیم جس نے دارالاسلام کے نام سے علامہ اقبال کے ذہن میں جنم لیا اور جس پر کام کرنے کے لئے جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ علامہ کی دعوت پر حیدر آباد دکن سے نقل مکانی کر کے پنجاب کے ضلع گورداسپور کے ایک دور افتادہ دیہات پٹھانکوٹ میں آکر آباد ہوئے، علامہ اقبال کی وفات کے کچھ عرصے بعد ہی دم توڑ گئی۔ مولانا مودودی مرحوم نے علامہ اقبال مرحوم کی وفات کے بعد ان کے متعین کردہ خطوط کے بجائے اپنے لئے خود راہ عمل متعین کی اور خالص علمی سطح پر کام کرنے کی بجائے دعوت کے میدان کو زیادہ ترجیح دی۔ اگرچہ ابتداً جماعت اسلامی کے پیش نظر بھی وہ سارے کام تھے جن کے لئے علامہ اقبال "دارالاسلام" بنانا چاہتے تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے عملی سیاست میں ہمہ تن اور ہمہ وقت مصروف ہونے کی وجہ سے جماعت کے پیش نظر سارے علمی منصوبے رفتہ رفتہ پس منظر میں چلے گئے۔ اور پھر ایک مرحلے پر مولانا مودودی کے گرد اکٹھی ہونے والی علمی شخصیات کے لئے بھی جماعت میں رہنا ممکن نہ رہا۔ علامہ اقبال کی اس سکیم کے خدوخال کا اندازہ جامعہ ازہر کے شیخ علامہ مصطفیٰ المراغی کے نام ان کے خط کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور علوم دینیہ کے چند ماہرین کو یہاں جمع کریں یہ ایسے حضرات ہوں جن میں میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتیں ہوں اور ان کی رہنمائی کے لئے ہم ایک ایسا معلم جو کامل اور سالک ہو اور قرآن حکیم میں مہارت تامہ رکھتا ہو نیز انقلاب دور حاضر سے بھی

واقف ہو مقرر کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کو کتاب اور سنت رسول اللہ کی روح سے واقف کرے اور تفکر اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ ' حکمت ' اخلاق ' سیاسیات اور اقتصادیات کے علوم میں ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدن اسلامی کے دوبارہ زندہ کے لئے جہاد کر سکیں! (اقبال دارالاسلام اور مودودی ص - ۲)

قرآن اکیڈمی

دارالارشاد اور دارالاسلام کی سکیموں کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ اس لئے کیا گیا ہے کہ ان دونوں میں انجمن خدام القرآن کی قرآن اکیڈمی کی سکیم کے ساتھ حیرت انگیز مشابہت و مماثلت پائی جاتی ہے۔ میں نے بھی جون ۱۹۶۷ء میں قرآن اکیڈمی کے منصوبے کا خواب دیکھا تھا اور "میثاق" کے صفحات پر اس کا اظہار کیا تھا اللہ کے فضل و کرم سے آج یہ اکیڈمی ایک محسوس و مشہور حقیقت کی صورت میں موجود ہے۔ اس اعتبار سے میں اپنے آپ کو دنیا کا انتہائی خوش قسمت انسان سمجھتا ہوں۔ قرآن اکیڈمی کو موجودہ مرحلے تک پہنچانے میں ہم نے قدم بقدم پیش قدمی کی ہے۔ اس کی ابتداء ایک دارالقامہ یعنی ہوسٹل سے ہوئی تھی جس میں کالجوں اور یونیورسٹی کے زیر تعلیم طلبہ کے لئے رہائش کا انتظام کیا گیا تھا دوسرے مرحلے میں ایک معہد ثانوی یعنی ہائی اسکول کا آغاز کیا گیا جس میں مڈل پاس طلبہ داخل کئے گئے۔ اور عربی کی لازمی تدریس کے ساتھ میٹرک کی تیاری کروائی گئی بالآخر ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۱ کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلس منتظمہ نے اپنے ایک خصوصی اجلاس میں قرآن اکیڈمی میں رفاقت یعنی فیلوشپ کی اسکیم شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کے تحت ان اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی دینی تعلیم کے سلسلے کا آغاز کیا گیا جنہوں نے تعلیم و تعلّم قرآن کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ——————

—————— یکم اپریل ۱۹۸۲ء سے ان چھ نوجوانوں کی دینی تعلیم کا آغاز ہوا جن میں سے ایک ایم بی بی ایس ' ایک بی ڈی ایس ' دو ایم ایس سی ' ایک ایم اے فلسفہ اور ایک ایم اے ایل ایل بی شامل تھے۔ یوں تو یہ سب ہی میری آنکھ کا نور اور دل کا سرور ہیں۔ لیکن الحمد اللہ ثم الحمد اللہ کہ ان میں دو وہ بھی تھے جنہیں عرف عام میں نور چشم ' اور لخت جگر کہا جاتا ہے۔ پھر اگلے برس چالیس سے زائد طلبہ پر مشتمل ایک ایسے گروپ کی دو سالہ تدریس کا سلسلہ شروع ہوا جس میں نصف کے قریب ایف اے ' ایف ایس سی ' بی ایس سی اور ایم اے ایم ایس سی نوجوان تھے اور نصف کے قریب فارغ

التحصیل اور بر سر کار انجینئر ڈاکٹر اور دوسرے ایسے ہنر مند حضرات شامل تھے جنہوں نے اپنی کاروباری اور ملازمتی مصروفیات میں سے دو سال دین کا علم حاصل کرنے کے لئے نکالے تھے۔ دو سالہ تدریسی نصاب کا تیسرا گروپ بھی اپنی تعلیم کا پہلا سال مکمل کر چکا ہے۔ اس دو سالہ تعلیم کا نصاب بنیادی طور پر پہلے سال میں پختہ بنیادوں پر عربی زبان کی تعلیم اور پھر دوسرے سال میں ترکیب نحوی و صرفی کے ساتھ سبقاً سبقاً قرآن حکیم کی تدریس پر مشتمل ہے اس کے علاوہ حدیث فقہ اور اصول فقہ کی بنیادی تدریس بھی نصاب میں شامل ہے۔ دو سالہ کورس کے منتہی طلبہ میں سے منتخب نوجوانوں پر مشتمل تیسرے سال کی ایک کلاس بھی تجرباتی بنیادوں پر شروع کی گئی تھی جس کے نصاب میں اصول حدیث 'اصول فقہ اور عربی ادب کی بنیادی کتب شامل تھیں لیکن بوجوہ اس کورس کو تکمیل سے قبل ہی ملتوی کرنا پڑا۔ قرآن اکیڈمی کی تعمیر اور اس میں تدریس کا یہ منصوبہ میری بیس اکیس برس کی محنتوں اور آپ کے تعاون سے تقریباً ۳۵ لاکھ روپے کے خرچ سے اپنی موجودہ شکل میں سامنے آیا ہے۔

قرآن کالج

اب قرآن کالج کی تعمیر کا مرحلہ اور نئی عمارت کی تعمیر تک قرآن اکیڈمی میں ہی قرآن کالج کی کلاسوں کا اجراء پیش نظر ہے۔ قرآن کالج کی پوری سکیم اور اسکا پراسپکٹس حکمت قرآن کے صفحات میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں گزشتہ برس بھی قرآن کالج لی کلاسوں کے اجراء کے لئے اخبارات میں اشتہارات دیئے گئے تھے۔ لیکن آپ حضرات کے عدم تعاون کی وجہ سے اتنی تعداد میں با صلاحیت طلبہ میسر نہ آسکے کہ ہم باقاعدہ کلاس شروع کر دیتے اس لئے یہ کام ایک سال کے لئے موخر کرنا پڑا۔ مولانا احمد علی لاہوری چالیس برس تک اس شہر لاہور میں درس قرآن دیتے رہے وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اے لاہوریو تم چودہ چودہ برس تک اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلواتے ہو اگر تم انہیں چودہ سال کے لئے ہمارے پاس بھیجو تو ہم انہیں دین پڑھائیں۔ علم و حکمت کا وہ خزانہ انہیں منتقل کریں جو ہمارے پاس ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ ان کی اس پکار نے کتنے لوگوں کو متاثر کیا! در حقیقت عوامی سطح پر یہ غفلت اور یہ عدم تعاون پکارنے والے کے اجر میں اور اس کی محنت میں کوئی کمی واقع نہیں ہونے دیتا پکارنے والے نے اگر بددل ہو کر اپنا راستہ بدل نہیں دیا اور زندگی کی آخری سانس تک اپنے کام میں لگا رہا تو اس کا اجر اس کے اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ لیکن وہ لوگ جو ادب کے ساتھ ایسے بزرگوں اور پکارنے والوں کی صحبتوں میں بیٹھتے ہیں ہر طرح کی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں مگر اس پکار کے جواب میں اپنی اولاد کو اس کام کے لئے وقف نہیں کرتے انہیں اللہ کے ہاں عام لوگوں کی نسبت زیادہ جوابدہی کرنی پڑے گی کیوں کہ ان پر تو ایک حجت قائم ہو چکی۔

انداز کرتے ہوئے اپنی ذہین اولاد کو قرآن کی تعلیم کے لئے قرآن کالج میں داخلہ دلوایئے۔ ہم تین سال میں انہیں گریجویٹ بنا کر آپ کو واپس کریں گے۔ صرف ایک سال زائد لگانے کے بعد ان کے سامنے سوائے میڈیکل اور انجینئرنگ کے باقی سارے کیریئر موجود ہوں گے مقابلے کے امتحان اور وکالت کے شعبے میں کھلے امکانات ہیں۔ اور ان دونوں میدانوں میں تو اب دینی تعلیم بھی انشاء اللہ فائدہ مند ہوگی کیونکہ نفاذ شریعت کی کوششوں کے نتیجے میں انشاء اللہ شریعت کا کچھ نہ کچھ عمل دخل اور نفاذ انتظامیہ اور عدلیہ کے ذریعے ضرور ہوگا۔

اور سب سے بہتر کیریئر حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی خیر کم من تعلم القرآن و علمہ تم سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں (صحیح بخاری بروایت حضرت عثمانؓ) کے مطابق تو اعلیٰ پیمانے پر قرآن سیکھنے اور سکھانے میں اپنے آپ کو لگا دینا ہے۔ عشق رسولؐ کے دعوے تو آسان ہیں مگر اس کے کچھ عملی تقاضے بھی ہیں۔ اس کے لئے کچھ قربانی بھی درکار ہے اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہنوں میں رہنی چاہیے کہ آج تک جن عظیم ہستیوں نے دینی میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں ان کی بڑی تعداد ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اچھے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کے والدین نے برضاورغبت انہیں دین کی تعلیم دلوائی تھی وہ ان نفسیاتی الجھنوں سے پاک تھے۔ جو انسانی کردار کو مجروح کر کے فکر کی بلند پروازی کے راستے بند کر دیتی ہیں۔ صرف ان ہی میں سے چند شخصیات کی مثالیں دیکھ لیجئے جن کا ذکر فہم قرآن کے سلسلے میں آچکا ہے۔ علامہ حمید الدین فراہی کا تعلق اعظم گڑھ کے مشہور انصاری خاندان سے تھا اور ان کے دادا شیخ قربان قنبر انصاری انگریزی تسلط کے ابتدائی دور میں اعظم گڑھ کے مشہور وکیل تھے۔ علامہ شبلی نعمانی کے والد شیخ حبیب اللہ مرحوم اپنے علاقے کے بہت بڑے زمیندار اور تاجر تھے۔ وکالت و زمینداری اور نیل اور شکر کی تجارت سے انیسویں صدی کے آخر میں ان کی سالانہ آمدنی تقریباً تیس ہزار روپے سالانہ تھی اور سرکار کو چھ ہزار روپے سال کی مالگزاری دیتے تھے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد شیخ عبدالحق صاحب ایک مقتدر رئیس اور میرٹھ کی ایک بڑی ریاست کے مختار عام تھے اگر علماء کرام کے تذکروں کو کھنگالا جائے تو اس قسم کی کئی مثالیں مل جائیں گی۔ میں آپ کو یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ اپنی اولاد کو جدید تعلیم سے محروم رکھیں یا انہیں دینی مدارس میں بھیج دیں دینی مدارس کا معاملہ بھی جدید تعلیم کی طرح یک رخا ہے۔ وہ اپنی جگہ جو کام کر رہے ہیں اگرچہ وہ انتہائی مفید اور ضروری ہے اور ان کی کوششوں اور قربانیوں سے ہمارے معاشرے کی مذہبی زندگی قائم ہے اور مسجدیں آباد ہیں لیکن جدید علوم سے بے خبری کے باعث احیاء اسلام کے عظیم کام کی صلاحیت سے میں انہیں محروم پاتا ہوں میں نے خود اپنی اولاد کو ان مدرسوں

میں نہیں بھیجا بلکہ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اس قرآن اکیڈمی میں دینی علوم سے روشناس کروایا ہے۔ میرا بڑا داماد جو ڈینٹل سرجن ہے وہ بھی قرآن اکیڈمی کا دو سالہ نصاب پڑھ چکا ہے۔ اور گزشتہ برس سے گڑھی شاہو میں رمضان المبارک کے دوران تراویح کے ساتھ ترجمہ قرآن سنا رہا ہے میرا دوسرا داماد جس سے مجھے بڑی توقعات اور امیدیں تھیں 'اللہ تعالیٰ نے اسے میرے لئے اور اس کے والدین کے لئے توشہ آخرت بنا دیا گزشتہ برس اکتوبر میں کار کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا مرحوم قرآن اکیڈمی کا دو سالہ کورس کو نہایت کامیابی سے مکمل کرنے کے بعد تیسرے سال کی تدریس میں شریک تھا۔ اس سارے تذکرے کا مقصد یہ ہے کہ میں آپ کو کسی ایسے کام کی دعوت نہیں دے رہا جس میں میں نے اپنی اولاد کو نہ لگایا ہو۔ میں پھر یہ گزارش کروں گا کہ ہمیں اپنے بچے دیجئے۔ یہ سب سے بڑا چندہ ہے اور یہ سب سے بڑا ایثار ہے۔ کوئی کروڑ پتی اگر ایک لاکھ روپے کا چیک ہمیں دے دے گا تو میری نگاہ میں اس کی وہ وقعت نہیں ہے جتنی کہ اس بات کی ہے کہ ایک صاحب حیثیت شخص جو اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلا سکتا ہو اپنے کسی بچے کو اعلیٰ ترین علمی سطح پر دین کی خدمت کے لئے وقف کر دے۔ صاحب حیثیت گھرانوں کے بچے اگر اس طرف آئیں گے تو وہ احساس کمتری سے پاک ہوں گے وہ لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے اعتماد سے دین کی بات کر سکیں گے۔ جب یہ کام بڑے پیمانے پر ہو گا تو انشاء اللہ صورتحال بدلے گی دین کا فہم اور بصیرت رکھنے افراد کے جس قحط سے ہم آج دوچار ہیں انشاء اللہ وہ دور ہو گا۔

ہر شخص اپنے آپ سے سوال کرے اپنے گریبان میں جھانکے آپ دین کے لئے اپنے بچے کا ایک سال بھی دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ جبکہ دنیاوی کیریئر اور مادی ترقی کے لئے داخلوں کے لئے حرام حلال تمام ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے دین و ایمان 'تہذیب و شرافت ہر چیز کو داؤ پر لگا کر اپنے بچوں یورپ اور امریکہ بھجواتے ہیں۔ جو اس کام کی مقدرت و استطاعت نہیں رکھتے وہ اس کی حسرت رکھتے ہیں حالانکہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کتنے ہی نوجوان یورپ اور امریکہ وغیرہ جا کر وہاں کی تہذیب اور معاشرت کے رنگ میں رنگے گئے انہوں نے اپنے ملک اپنے والدین اپنے معاشرے ہر چیز کو تج دیا۔ وہاں شادیاں کر لیں اب ماں باپ کو شکل تک دکھانے کے وہ روادار نہیں۔ اور وہ ماں باپ جنہوں نے بڑے چاؤ سے اور بڑی امیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ اپنے جگر گوشوں کو اپنے سے جدا کر کے بھیجا تھا حسرت اور افسوس سے ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ایسے سینکڑوں واقعات ہمارے سامنے پیش آتے ہیں مگر ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ایک اندھی دوڑ ہے جس میں آنکھیں بند کر کے عامی و عالم 'غریب اور امیر سبھی دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

قرآن مجید میں انفاق پر کتنا زور دیا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد صرف مال خرچ کرنا ہے۔ حالانکہ سب سے اہم رزق جو اللہ نے انسان کو دیا ہے وہ اسکی صحت ' ذہانت ' فراست ہے جسمیں تمام انسان برابر نہیں۔ جس کو جس پہلو سے اللہ نے نوازا ہے یہ اس کا نصیب اور اس کا رزق ہے۔ عربی زبان میں رزق کا لفظ بڑے وسیع مفہوم کا حامل ہے مراد صرف یہ کھانا پینا نہیں ہے۔ سورہ واقعہ میں ارشاد ربانی ہے۔

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝ اے لوگو تم نے اپنا رزق (نصیب) یہ ٹھہرایا ہے کہ تم (قرآن کی) تکذیب کر رہے ہو۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ رزق سے مراد انسان کا نصیب ہے۔ انسان کی اندرونی صلاحیتوں کے بعد مال ' اولاد ' خاندان ' عزت و شرافت سب اللہ کا دیا ہوا رزق ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اہم اور پیارا رزق انسان کی اولاد ہے۔ اس کو اللہ کی راہ میں لگانا سب سے مشکل اور کٹھن کام ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری اولاد آپ کے سامنے اس کام میں لگی ہوئی ہے بڑا بیٹا ڈاکٹر ہے جو میری غیر حاضری میں آپ کے سامنے میری جگہ خطاب کرتا ہے۔ دوسرا ایم اے فلسفہ ہے جو ہر جمعے کو یہاں نماز جمعہ کی امامت کے فرائض ادا کرتا ہے۔ دونوں میرے کام میں میرے دست و بازو ہیں۔ یہ میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ اپنی اولاد کو اس کام میں لگانے کے بعد آپ سے آپ کی محبوب ترین شے مانگ رہا ہوں سب سے پہلے اپنے بچے دیجئے۔ اگر آپ نے پیش قدمی نہ کی تو قرآن کالج کی سکیم فیل ہو جائے گی آج میں نے تاکید اور اپیل کے میدان میں اپنی ساری صلاحیت صرف کر دی ہیں۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے فضل خاص سے میری اپیل میں اثر پیدا کر دے اور آپ کو ہمت ' توفیق عطا کرے کہ آپ اپنے بچوں کو دین کی خاطر قرآن کالج میں داخل کروائیں۔ دوسرے درجے میں ہمیں پیسے کا چندہ بھی درکار ہے۔ قرآن کالج کی تعمیر میں ہم نے اپنے سارے وسائل صرف کر دیئے ہیں۔ اگر آپ حضرات کی طرف سے مزید وسائل نہیں آئیں گے۔ تو تعمیر کا کام رک جائے گا۔ اکیس برس کی خطابت میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں اپنے ادارے کے لئے آپ سے چندہ مانگ رہا ہوں۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ اس چندے کی اہمیت میرے نزدیک ثانوی ہے اصل چندہ آپ کی اولاد ہی کا مطلوب ہے۔ پوری دلی آمادگی کے ساتھ اپنے مال اور اولاد کو اللہ کے دین کے لئے لگا دیجئے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

مولانا محمد تقی امینی

قوم بنی اسرائیل کی احسان فراموشی و گمراہی

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا ... وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ

اے بنی اسرائیل میرے انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور یہ کہ میں نے دنیا جہان والوں پر فضیلت دی[1] اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ اس کے لئے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

---

[1] پہلے خاص طور سے علم و فضل کے انعام کا ذکر تھا جو دین و شریعت کی راہ سے انہیں حاصل ہوا تھا۔ اب خاص طور سے قیادت و سرداری کے انعام کا ذکر ہے۔ یہ بھی انہیں (بنی اسرائیل) دین و شریعت ہی کی راہ سے حاصل ہوئی تھی۔ علم و فضل کے لئے یا قیادت و سرداری کے لئے بنی اسرائیل کا انتخاب اور قوموں کے مقابلہ میں اہلیت و لیاقت کی بنا پر تھا۔ کسی جانب داری یا رعایت کی بنا پر نہ تھا جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (دخان: آیت ۳۲) اور ہم نے اپنے علم سے دنیا جہان والوں کے مقابلہ میں ان کو چن لیا تھا۔

جب کوئی نعمت کسی قوم کے پاس زیادہ دن تک برقرار رہتی ہے تو وہ اس کو اللہ کا انعام سمجھنے کی بجائے اس کو اپنا حق سمجھنے لگتی ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ جو کچھ ہمیں حاصل ہے یہ ہمارا ذاتی حق ہے جو بہر حال ہمارے پاس رہے گا۔ خواہ ہمارے اندر کتنی ہی کمی کیوں نہ آ جائے۔ آیت میں اسی خیال کی تردید ہے کہ ہمارا انتخاب جان بوجھ کر اور دیکھ بھال کر (علی علم) ہوتا ہے اور

قرآن مجید میں انفاق پر کتنا زور دیا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد صرف مال خرچ کرنا ہے۔ حالانکہ سب سے اہم رزق جو اللہ نے انسان کو دیا ہے وہ اسکی صحت ' ذہانت ' فراست ہے جسمیں تمام انسان برابر نہیں۔ جس کو جس پہلو سے اللہ نے نوازا ہے یہ اس کا نصیب اور اس کا رزق ہے۔ عربی زبان میں رزق کا لفظ بڑے وسیع مفہوم کا حامل ہے مراد صرف یہ کھانا پینا نہیں ہے۔ سورہ واقعہ میں ارشاد ربانی ہے۔

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝ — اے لوگو تم نے اپنا رزق (نصیب) یہ ٹھہرایا ہے کہ تم (قرآن کی) تکذیب کر رہے ہو۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ رزق سے مراد انسان کا نصیب ہے۔ انسان کی اندرونی صلاحیتوں کے بعد مال ' اولاد ' خاندان ' عزت و شرافت سب اللہ کا دیا ہوا رزق ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اہم اور پیارا رزق انسان کی اولاد ہے۔ اس کو اللہ کی راہ میں لگانا سب سے مشکل اور کٹھن کام ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری اولاد آپ کے سامنے اس کام میں لگی ہوئی ہے بڑا بیٹا ڈاکٹر ہے جو میری غیر حاضری میں آپ کے سامنے میری جگہ خطاب کرتا ہے۔ دوسرا ایم اے فلسفہ ہے جو ہر جمعے کو یہاں نماز جمعہ کی امامت کے فرائض ادا کرتا ہے۔ دونوں میرے کام میں میرے دست و بازو ہیں۔ یہ میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ اپنی اولاد کو اس کام میں لگانے کے بعد آپ سے آپ کی محبوب ترین شے مانگ رہا ہوں سب سے پہلے اپنے بچے دیجئے۔ اگر آپ نے پیش قدمی نہ کی تو قرآن کالج کی سکیم فیل ہو جائے گی آج میں نے تاکید اور اپیل کے میدان میں اپنی ساری صلاحیت صرف کر دی ہیں۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے فضل خاص سے میری اپیل میں اثر پیدا کر دے اور آپ کو ہمت ' توفیق عطا کرے کہ آپ اپنے بچوں کو دین کی خاطر قرآن کالج میں داخل کروائیں۔ دوسرے درجے میں ہمیں پیسے کا چندہ بھی درکار ہے۔ قرآن کالج کی تعمیر میں ہم نے اپنے سارے وسائل صرف کر دیئے ہیں۔ اگر آپ حضرات کی طرف سے مزید وسائل نہیں آئیں گے۔ تو تعمیر کا کام رک جائے گا۔ ایسی برس کی خطابت میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں اپنے ادارے کے لئے آپ سے چندہ مانگ رہا ہوں۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ اس چندے کی اہمیت میرے نزدیک ثانوی ہے اصل چندہ آپ کی اولاد ہی کا مطلوب ہے۔ پوری دلی آمادگی کے ساتھ اپنے مال اور اولاد کو اللہ کے دین کے لئے لگا دیجئے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

مولانا محمد تقی امینی

قوم بنی اسرائیل کی احسان فراموشی و گمراہی

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا ... وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ

اے بنی اسرائیل میرے انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور یہ کہ میں نے دنیا جہان والوں پر فضیلت دی[1] اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ اس کے لئے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ لیا جائے گا اور نہ اس کی مدد کی جائے گی[2]

---

[1] پہلے خاص طور سے علم و فضل کے انعام کا ذکر تھا جو دین و شریعت کی راہ سے انہیں حاصل ہوا تھا۔ اب خاص طور سے قیادت و سرداری کے انعام کا ذکر ہے۔ یہ بھی انہیں (بنی اسرائیل) دین و شریعت ہی کی راہ سے حاصل ہوئی تھی۔ علم و فضل کے لئے یا قیادت و سرداری کے لئے بنی اسرائیل کا انتخاب اور قوموں کے مقابلہ میں اہلیت و لیاقت کی بنا پر تھا۔ کسی جانب داری یا رعایت کی بنا پر نہ تھا جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (دخان: آیت ۱۲) — اور ہم نے اپنے علم سے دنیا جہان والوں کے مقابلہ میں ان کو چن لیا تھا۔

جب کوئی نعمت کسی قوم کے پاس زیادہ دن تک برقرار رہتی ہے تو وہ اس کو اللہ کا انعام سمجھنے کی بجائے اس کو اپنا حق سمجھنے لگتی ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ جو کچھ ہمیں حاصل ہے یہ ہمارا ذاتی حق ہے جو بہر حال ہمارے پاس رہے گا۔ خواہ ہمارے اندر کتنی ہی کمی کیوں نہ آ جائے۔ آیت میں اسی خیال کی تردید ہے کہ ہمارا انتخاب جان بوجھ کر اور دیکھ بھال کر (علی علم) ہوتا ہے اور

اسی وقت تک رہتا ہے جب تک وہ قوم ذمہ داریوں کو پوری کرتی اور ان مواقع سے فائدہ اٹھاتی ہے جو اسے حاصل ہیں۔ اور جب اس میں کمی آتی ہے تو اسی لحاظ سے وہ گردش میں مبتلا ہو جاتی ہے پھر اگر سنبھلنے میں کامیاب نہیں ہوتی اور اپنی حالت نہیں درست کرتی تو رفتہ رفتہ وہ ہٹا دی جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم کا انتخاب کر لیا جاتا ہے۔ یہ انتخاب بھی جان بوجھ کر اور دیکھ بھال کر ہوتا ہے۔

ٹے دنیوی سزا سے بچنے کے لئے عام طور سے یہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں (۱) کوئی کسی کی طرف سے کچھ دے دلا کر کام نکال دے (۲) بڑی سفارش پہونچا دے (۳) جرمانہ ادا کر دے۔ (۴) زور و زبردستی سے مدد کی کوئی اور شکل نکال لے۔ آخرت کی سزا سے بچنے کے لئے ان میں سے نہ کسی طریقہ کا وجود ہوگا۔ اور نہ وہ کارگر ہو سکے گا۔

وَاِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ تا عَظِيْمٌ

"اور جب ہم نے تمہیں فرعونیوں کے شکنجہ سے نجات دی لے وہ تمہیں بری طرح عذاب کا مزہ چکھاتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی ٹے"

لے بنی اسرائیل کو اب ان کی پچھلی تاریخ کے واقعات یاد دلائے جا رہے ہیں تفصیل اس لئے نہیں بیان کی کہ یہ واقعات ان میں عام طور سے مشہور تھے اور ان پر فخر کرتے تھے۔

قوموں کو اٹھانے اور ان کو ترقی کی راہ پر لگانے میں ان کی پچھلی شاندار تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ قوم کو اس کا کھویا ہوا مقام یاد دلایا جاتا ہے۔ اس کی حمیّت و غیرت کو ابھارا جاتا ہے اور اسمیں جوش و جذبہ اور حوصلہ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ اسی بناء پر کوئی قوم شاندار تاریخ کو بھول کر اپنی بنیادوں پر ترقی نہیں کر سکتی ہے۔

ٹے حکومت کا ظلم و ستم قومی زندگی کو آگے بڑھانے اور اس کو ترقی دینے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ پھر مردوں کو زندگی اور ترقی کی راہوں سے محروم کر دینا اور عورتوں کو زندگی اور ترقی کے مواقع فراہم کرنا اسمیں کسی بھی قوم کے لئے بڑی آزمائش ہے۔ پھر وہ قوم جو پس ماندہ ہو اور جس کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لئے قدم قدم پر مدد اور سہارا کی ضرورت ہو۔ اس کے لئے تو یہ صورت حال اور زیادہ عذاب جان بنتی ہے۔

(باقی ص ۶۴ پر)

باب پنجم

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

☆

قرآنِ حکیم کی اساس پر تجدیدِ ایمان اور احیاءِ علم کی نئی تحریک!

فرمانِ نبویؐ [1]

مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْإِسْلَامَ فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّينَ دَرَجَةٌ وَّاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ

[1] رواہُ الدّارمیُّ عن الحسن مرسلاً ورواہُ ایضاً الطبرانیُّ فی الاوسطِ عن ابن عباسٍ وکذا الخطیبُ عنہُ مرفوعاً ——— (لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح)

- فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء
- بنیادی نقطۂ نظر
- عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش
- مدافعت کی اوّلین کوششیں اور اُن کا ماحصل
- علومِ عمرانی کا ارتقاء
- اسلامی نظامِ حیات کا تصوّر اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں
- تعبیر کی کوتاہی
- اُحیائے اسلام' کی شرطِ لازم: تجدیدِ ایمان'
- کرنے کا اصل کام
- عملی اقدامات

فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء

موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دور ہے۔ آج پورے کرۂ ارضی پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتداء آج سے تقریباً دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی اور جو اس کے بعد مسلسل مستحکم ہوتے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔ آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصّوں میں منقسم ہو تقریباً ایک ہی طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات سے قطع نظر ایک ہی تہذیب اور ایک ہی تمدّن کا سکّہ پوری دنیا میں رواں ہے۔ کہیں کہیں منتشر طور پر کوئی دوسرا نقطۂ نظر اور طرزِ فکر اگر پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زندگی کی اصل شاہراہ سے ہٹی ہوئی پگڈنڈی سے زیادہ نہیں ہے۔ ورنہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ جو طبقے قیادت و سیادت کے مالک ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ متضمّنات کی اصل زمام کار ہے وہ سب کے سب بلا استثناء ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدّن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلّط اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بعض ان قوّتوں کے نقطۂ نظر کا جائزہ بھی اگر دقّتِ نظر سے لیا جائے جو مختلف ممالک میں مغربی تہذیب و تمدّن کے خلاف صف آراء ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مغرب کے اثرات سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہیں اور خود ان کا طرزِ فکر بہت حد تک مغربی ہے۔

بُنیادی نقطۂ نظر

تہذیبِ جدید کی بنیاد میں جو فکر کام کر رہا ہے وہ نہ تو کوئی ایک دن میں پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی کوئی سادہ اور بسیط شئے ہے بلکہ ان ڈیڑھ دو سو سالوں کے دوران فلسفے کے کتنے ہی مکاتبِ فکر یورپ میں پیدا ہوئے اور کتنے ہی زاویہ ہائے نگاہ سے انسانوں نے انسان اور انسانی زندگی پر غور و فکر کیا ——— لیکن اس پورے ذہنی و فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں 'خیالی' اور 'ماورائی' تصوّرات کے بجائے 'ٹھوس' حقائق و واقعات کو غور و فکر اور سوچ بچار کا اصل مرکز و محور ہونے کی حیثیّت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ بحث قرار دیا گیا ہے۔ خالص علمی سطح پر تو اگرچہ یہ کہا گیا کہ ہم خدا، روح اور حیات بعد الممات کا نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار لیکن اس عدمِ اقرار و انکار کا نتیجہ بہر حال یہ نکلا کہ یہ تصوّرات، رفتہ رفتہ بالکل خارج از بحث ہوتے چلے گئے اور انسان کے سارے غور و فکر اور تحقیق و تجسّس کا مرکز و محور کائنات، مادّہ اور حیاتِ دنیوی بن کر رہ گئے۔

انسان کو اللہ تعالےٰ نے جن بے پناہ قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ انہیں جس میدان میں بھی استعمال کرے نتائج بہر حال رونما ہوتے ہیں اور ہر ڈھونڈنے والا اپنے اپنے دائرۂ تحقیق و جستجو میں نئی دنیائیں تلاش کر سکتا ہے ——— پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح کائنات کی عظمت و وسعت کے اعتبار سے مہر درخشاں کی حیثیّت و وقعت ایک "ذرّہ فانی" سے زیادہ نظر نہیں آتی لیکن اگر ایک "ذرّہ فانی" کی حقیقت و ماہیّت پر غور کیا جائے تو وہ بجائے خود "مہر درخشاں" کی عظمت و سطوت کا حامل نظر آتا ہے[1]۔ اسی طرح بحقیقتِ

---

[1] مہر درخشاں ذرّہ فانی ——— ذرّہ فانی مہر درخشاں (کوثر)

"لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں" اقبال

نفس الامری کے اعتبار سے چاہے خدا کے مقابلے میں کائنات، روح کے مقابلے میں مادّہ اور حیات اخروی کے مقابلے میں حیاتِ دنیوی کیسے ہی حقیر اور کتنے ہی بے وقعت ہوں اگر نگاہوں کو انہی پر مرکوز کر دیا جائے تو خود ان کی وسعتیں بے کراں اور گہرائیاں اتھاہ نظر آنے لگتی ہیں۔

چنانچہ یورپ میں جب 'کائنات' اور 'مادّہ' تحقیق و جستجو کا موضوع بنے تو یکے بعد دیگرے ایسے ایسے عظیم انکشافات ہوئے اور بظاہر خفتہ و خوابیدہ مظاہرِ قدرت کے پردوں میں ایسی ایسی عظیم قوتوں اور توانائیوں کا سُراغ ملا کہ عقلیں دنگ اور نگاہیں چکا چوند ہو کر رہ گئیں اور علم و فن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا ——— قدرت کے قوانین کی مسلسل دریافت، فطرت کی قوّتوں کی پیہم تسخیر اور نت نئی ایجادات و اختراعات نے ایک طرف تو یورپ کو ایک ناقابلِ شکست قوت بنا دیا اور دوسری طرف مادّے کی یہ عظمت اور اس کی قوّتوں کی یہ سطوت بجائے خود اس امر کی دلیل بنتی چلی گئیں کہ اصل قابلِ التفات شئ مادّہ ہے نہ کہ روح اور کائنات اور اس کے قواعد و قوانین ہیں نہ کہ خدا اور اس کی ذات و صفات! ———!!

عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش

فطرت کی ان نو تسخیر شدہ قوتوں سے مسلّح ہو کر مغرب جب مشرق پر حملہ آور ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیلاب کے مانند پورے کرۂ ارضی پر چھا گیا اور مشرقی اقوام اور ان کی عظیم حکومتیں اور سلطنتیں اس سیلاب میں ریت کے کچّے گھروندوں کی طرح بہتی چلی گئیں۔ اس سیلاب کا اوّلین شکار چونکہ مشرقِ قریب اور مشرقِ وسطیٰ تھے جہاں مسلمان آباد تھے۔ لہٰذا اس کی سخت ترین یورش اسلام اور اہلِ اسلام پر ہوئی اور چند ہی سالوں کے اندر اندر پورا عالمِ اسلام یورپ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔

عالمِ اسلام پر مغرب کا یہ استیلاء دو گونہ تھا یعنی عسکری و سیاسی بھی اور ذہنی و فکری بھی لیکن یورپ کی اوّلین اور نمایاں ترین یورش چونکہ سیاسی تھی لہٰذا عالمِ اسلام میں جو ردِّ عمل اس کے خلاف

پیدا ہوا اس میں بھی اوّلاً اسی کا احساس غالب نظر آتا ہے۔ ملّتِ اسلامی کے اس تلخ احساس نے کہ یورپ نے کہیں براہ راست تسلّط اور قبضے۔ اور کہیں انتداب و تحفظ و حمایت کے پردے میں اسے اپنا محکوم بنا لیا ہے اور اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ بار ہا درد انگیز نالوں کی صورت اختیار کی اور اپنے شاندار ماضی کی حسرت بھری یاد، اپنی "عمرِ رفتہ" اور عظمت و سطوتِ گزشتہ کے بازیافت کی شدید تمنّا اور "گردشِ ایّام" کو پیچھے کی طرف لوٹانے کی بے پناہ خواہش نے کبھی سیّد جمال الدین افغانی کی سیماب وش شخصیّت کا رُوپ دھارا اور کبھی تحریکِ خلافت کی صورت اختیار کی لیکن حقائق نے ہر بار جذبات و خواہشات کا منہ چڑایا۔ اور مغرب کی سیاسی بالادستی رفتہ رفتہ ایک تسلیم شدہ واقعہ کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

اپنے سیاسی تسلّط کو مستحکم کرتے ہی یورپ نے دنیائے اسلام میں اپنے افکار و نظریات کا پرچار اور اپنے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبلیغ ——— یعنی ذہنی و فکری تسخیر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نگاہیں مغرب کی مادّی ترقی سے پہلے ہی خیرہ ہو چکی تھیں۔ پھر زندہ قوموں میں ہمیشہ کچھ بنیادی انسانی اوصاف لازماً موجود ہوتے ہی ہیں۔ کچھ ان کی بنا پر مرعوبیت میں اضافہ ہوا نتیجتاً ایک مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیّت کے ساتھ مسلمانانِ عالم کے سوادِ اعظم نے مغربی افکار و نظریات کو جُوں کا توں قبول کرنا اور حرزِ جاں بنانا شروع کر دیا ——— خالص فلسفہ و عمرانیات کے میدان میں تو چونکہ خود مغرب میں بے شمار مکاتبِ فکر موجود تھے لہٰذا ان کے بارے میں تو پھر بھی کسی قدر قیل و قال اور ردّ و قدح یا کم از کم ترجیح و انتخاب کا معاملہ کیا گیا لیکن سائنس چونکہ بالکل حتمی اور قطعی تھی اور اس کے نتائج بالکل محسوس و مشہود تھے اور اس میدان میں چُون و چرا کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔ لہٰذا اس کا استقبال بالکل وحیِ آسمانی کی طرح ہوا اور اس کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادّہ پرستانہ طرزِ فکر رفتہ رفتہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کرتا چلا گیا۔ اور خدا کے بجائے کائنات، رُوح کے بجائے مادّے اور حیاتِ اخروی کے بجائے حیاتِ دنیوی کی اہمیّت پُوری امّتِ مسلمہ حتّٰی کہ اس کے خاصے دیندار اور مذہبی مزاج کے لوگوں کے

نزدیک بھی مسلّم ہوتی چلی گئی۔

مدافعت کی اوّلین کوششیں اور اُن کا حاصل

مغربی فلسفہ وفکر کی اس یلغار کے مقابلے میں اسلام کی جانب سے مدافعت کی کوششیں بھی اس دَوران میں ہوئیں اور بہت سے دردمند اور دین ومذہب سے قلبی لگاؤ رکھنے والے لوگوں نے ان کے تحفّظ کی سعی کی۔ تحفّظ ومدافعت کی یہ کوششیں دو طرح کی تھیں: ایک وہ جن میں محض تحفّظ پر قناعت کی گئی۔ اور دوسری وہ جن میں مدافعت کے ساتھ ساتھ مصالحت اور کسر و انکسار کی روش اختیار کی گئی۔

پہلی قسم کی کوشش وہ تھی جسے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اصحاب کہف کی سنّت کا اتّباع کہا جاسکتا ہے اور جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر کونوں کھدروں میں بیٹھ جاؤ اور اپنے دین وایمان کو بچانے کی فکر کرو۔ اس قسم کی کوششیں اگرچہ بظاہر زی فراریت کا مظہر نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ان کی اساس خالص حقیقت پسندی اور اس اعتراف پر تھی کہ مغرب کی اس یلغار کے کھلے مقابلے کی سکت اس وقت عالمِ اسلام میں نہیں ہے لہٰذا ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ اس سیلاب کے راستے سے ہٹ جایا جائے، اور ہر طرح کے طعن واستہزا کو انگیز کرتے ہوئے ایمان کی سلامتی کی فکر کی جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کامیابی بھی تھوڑی بہت اگر کسی کو ہوئی تو صرف اسی طریق کار کے اختیار کرنے والوں کو ہوئی اور اس کے نتیجے میں امّت کے ایک حصّے کا ایمان بھی سلامت رہ گیا۔ مادّہ پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روحانیت کی شمعیں بھی کہیں کہیں جلتی رہ گئیں اور قال اللہ وقال الرسولؐ کی صداؤں میں دین وشریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا ——— اس قسم کی کوشش کا مظہر اتم برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعتہً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی ———!

دوسری قسم کی کوششوں کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ ——— زمانے کا ساتھ بھی دیا جائے اور اسلام کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایک طرف جدید افکار و نظریات کے صحیح و غلط اجزاء کو چھانٹ کر علیحدہ کیا جائے اور دوسری طرف اسلام کی ایسی جدید تعبیر کی جائے جس سے اس کی حقّانیت ثابت ہو جائے۔

اس قسم کی کوششوں میں اوّل اوّل مرعوبیّت اور شکست خوردگی کے اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مغرب کی عقلیّت پرستی (RATIONALISM) کی کسوٹی پر ہند و مصر کے کچھ نیم متکلّم قسم کے لوگوں نے اسلامی اعتقادات و ایمانیات کو پرکھنا شروع کیا۔ نتیجۃً اسلامی عقائد کی کتر بیونت اور اس کے ماوراء الطبعیاتی اعتقادات کی خالص سائنٹیفک توجیہیں شروع ہوئیں ہندوستان میں سرسیّد احمد خاں مرحوم اور ان کے حلقہ اثر کے لوگوں اور مصر کے مفتی محمّد عبدہٗ اور ان کے تلامذہ کی نیّتیں کتنی بھی نیک رہی ہوں اور انہوں نے کتنے ہی خلوص کے ساتھ اس کی کوشش کی ہو کہ اسلام کی جدید تعبیر اور ماڈرن توجیہہ کر کے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور اس کے حلقہ بگوش اسے اپنے ساتھ لے کر ترقّی کی اُس راہ پر گامزن ہو سکیں جسے یورپ نے اختیار کیا تھا لیکن یہ بہرحال امر واقعہ ہے کہ اُن کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل کر رہ گئی اور مغرب کی مادّہ پرستانہ ذہنیّت کے تحت مذہب کا ایک کم و بیش لامذہبی ایڈیشن تیّار ہوا۔ جس کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو صرف یہ کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جو ذہن و فکر کے اعتبار سے ہی نہیں تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے بھی خالص یورپین بن چکے تھے اپنے اُوپر سے اسلام کا لیبل اتارنے کی ضرورت نہ پڑی اور وہ مسلم قومیّت کے حلقے میں شامل رہ گئے اور دین کا یہ جدید ایڈیشن ان کی جانب سے مغرب کی خدمت میں بطورِ معذرت پیش ہو گیا:

علومِ عمرانی کا ارتقاء

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، مغربی فکر کی اساس خدا، روح اور حیات

بعد الممات کے عدمِ اقرار و انکار کے پردے میں درحقیقت انکار پر تھی۔ چنانچہ ایک طرف تو خدا کے بجائے کائنات اور رُوح کے بجائے مادّہ تحقیق و جستجو کا مرکز و محور بنے جس کے نتیجے میں سائنسی انکشافات و ایجادات و اختراعات کا سلسلہ شروع ہوا ——— اور دوسری طرف حیاتِ اُخروی سِرے سے خارج از بحث ہو گئی، اور حیاتِ دنیوی گہرے غور و فکر اور شدید سوچ بچار کا موضوع بنی جس کے نتیجے میں مختلف عمرانی تصوّرات اور سیاسی و معاشی نظریات وجود میں آئے اور ان کی تالیف و تدوین سے مختلف نظام ہائے حیات پہلے علمی و فکری سطح پر اور پھر عالمِ واقعہ میں ظہور پذیر ہونا شروع ہوئے، چنانچہ ازمنہ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) کے تحت جو سیاسی و معاشی ڈھانچہ عرصۂ دراز سے دنیا میں رائج تھا اس کی جگہ سیاسی میدان میں قوم پرستی، آمریّت اور جمہوریّت کا رواج ہوا اور معاشی میدان میں سرمایہ داری اور سوشلزم برسرِکار ہوئے اور مختلف سیاسی و معاشی تحریکوں کا آغاز ہوا۔

اِسلامی نظامِ حیات کا تصوّر اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں

عمرانیات کے میدان میں مغرب کے اس فکری ارتقاء یا بالفاظِ صحیح افراط و تفریط کے دھکّوں کا اثر عالمِ اسلام پر یہ پڑا کہ یہاں بھی لوگوں نے اسلام پر بطورِ نظامِ زندگی غور و فکر شروع کیا اور اسلام نے حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ہدایات دی تھیں ان کی تالیف و ترتیب سے "اسلامی نظامِ حیات" کی تدوین ہوئی اور ساتھ ہی اس نظامِ زندگی کو دنیا میں عملاً نافذ کرنے کے لیے مختلف ممالک میں تحریکوں کا سلسلہ شروع ہُوا۔

بیسویں صدی عیسوی کی یہ اسلامی تحریکیں، جو انڈونیشیا سے مصر تک متعدد مسلمان ممالک میں تقریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں، بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں اور یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ تقریباً ایک ہی تصوّرِ دین ان کی پشت پر کام کر رہا ہے اور ایک ہی جذبہ ان میں سرایت کیے ہوئے ہے ——— پھر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی

وجہ سے عالمِ اسلام میں اسلام پر کم از کم ایک بہتر ضابطۂ حیات ہونے کے اعتبار سے عمومی اعتماد میں اضافہ ہوا ہے۔ اور نوجوان نسل کے ذہنوں سے مغرب کی عام مرعوبیّت میں بحیثیّتِ مجموعی کمی واقع ہوئی ہے۔

مغربی فلسفہ و فکر اور تہذیب و تمدّن سے مرعوبیّت میں عمومی کمی کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مغرب کے سیاسی غلبے اور عسکری تسلّط کا جو سیلاب تیزی سے آیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ رُک گیا ہے بلکہ مختلف ممالک میں قومی تحریکوں نے اس کا رُخ پھیر دیا ہے اور مغرب اپنی سیاسی بالادستی کی بساط رفتہ رفتہ تہہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے[1]۔ اور اگرچہ تحفّظ و حمایت کے پردے میں سیاسی بالادستی اور تعاون و امداد کے پردے میں معاشی تفوّق و برتری کے بندھن ابھی باقی ہیں۔ تاہم تقریباً پورا عالمِ اسلام مغربی طاقتوں کی براہِ راست محکومی سے آزادی حاصل کر چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب و تمدّن کا کھوکھلا پن تجربے سے ثابت ہو گیا اور خود مغرب میں محسوس کیا گیا کہ اس کی بنیاد غلط اور تعمیر کج ہے۔ خصوصاً مادہ پرستانہ الحاد جب اپنی منطقی انتہا کو پہنچا اور اس کی کوکھ سے سوشلزم اور کمیونزم نے جنم لیا اور انہوں نے انسانیت کی بچی کھچی اقدار کو بھی 'ٹھوس' معاشی مسئلے کے بھینٹ چڑھانا شروع کیا تو خود مغرب پریشان ہو گیا اور وہاں بھی نہ صرف انسانیت بلکہ دبی آواز میں روحانیت تک کا نام لیا جانے لگا۔ تیسرے یہ کہ، نہ صرف یہ کہ خود سائنس کی قطعیت اور حتمیّت ختم ہو گئی اور کچھ نئے نظریات نے نیوٹن کی طبعیات اور اقلیدسی ہندسے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ بلکہ خود مادّہ ٹھوس نہ رہا اور تحلیل ہو کر قوّتِ محض کی صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ ماورا الطبعیاتی عقائد کا اقرار نسبتاً آسان ہو گیا اور مذہب کو بحیثیّتِ مجموعی کسی قدر سہارا ملا۔ چوتھے یہ کہ مختلف مسلمان ممالک میں جب آزادی اور خود اختیاری کے حصول کے لیے قومی تحریکیں اٹھیں تو چونکہ مسلم قومیّت کی اساس بہرحال مذہب پر ہے لہٰذا جذبۂ قومی کی انگیخت کے لیے

---

[1] دولتِ برطانیہ نے جس طرح رفتہ رفتہ اپنی عظمت کی بساط لپیٹی ہے وہ تو اس دور کا ایک نہایت ہی عبرت آمیز واقعہ ہے۔

لامحالہ مذہبی جذبات کو اپیل کیا گیا جس سے احیائے اسلام کے تصوّر کو تقویت پہنچی۔

مندرجہ بالا اسباب و عوامل سے تقویّت پاکر 'احیائے اسلام'، 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' اور 'نفاذِ نظامِ اسلامی' کی تحریکیں مختلف مسلمان ممالک میں برسرِکار ہوئیں جن میں قوّت و وسعت اور جذبہ و امنگ کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' اہم تر تھی لیکن ایک ٹھوس اور مضبوط فکر کی حامل ہونے کے اعتبار سے برّصغیر پاک و ہند کی 'جماعتِ اسلامی' کو نمایاں مقام حاصل تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً ثلث صدی[1] سے مختلف مسلمان ملکوں میں برسرِعمل ہیں اور ملّتِ اسلامی کی نوجوان نسل کا ایک خاصا قابلِ ذکر حصّہ ان کے زیرِ اثر آیا ہے لیکن عملاً ان میں سے کسی کو کوئی نمایاں کامیابی کہیں حاصل نہیں ہو سکی۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں اپنا وقت پورا کر چکی ہیں اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے خواب کی تعبیر کا وقت ابھی نہیں آیا۔ چنانچہ مصر میں 'اخوان المسلمون' کا اندرونِ ملک تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے، اور اس کے باقیات الصالحات جلاوطنی کے عالم میں دُوَلِ عرب کی باہمی آویزش کے سہارے جی رہے ہیں۔ رہی برّصغیر کی تحریکِ اسلامی تو اس کا جزوِ اعظم پاکستانی سیاست کے نذر ہو چکا ہے اور اب اس کا مقام تحریکِ جمہوریّت کی حاشیہ برداری سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔[2]

ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اکثریّت کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور 'ترقّی پسند' عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آگئی لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے۔ ان کے تصوّرِ دین کی خامی اور مطالعۂ اسلام کے نقص کا۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ تحریر آج سے بیس سال قبل کی ہے۔ اب ان تحریکوں کی عمر نصف صدی سے متجاوز ہو چکی ہے۔ [2] یہ بات بھی آج سے دس سال قبل تک تھی گزشتہ دس سالوں کے دوران جماعت نے فوجی آمریت کے ساتھ 'شراکتِ اقتدار' سمجھوتہ کر کے اپنی پوزیشن خراب کر لی ہے!

تعبیر کی کوتاہی!

ذرا دِقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادّے اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعاتی اعتقادات کا اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے لیکن انہیں کچھ زیادہ درخورِ اعتناء اور لائق التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیتہً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز ہیں جو حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام 'اسلامی نظامِ زندگی' رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی ہستی کا اقرار تو موجود ہے لیکن 'ایمان باللہ' کی وہ کیفیت کہ آفاق و انفُس میں تنہا وہی فاعلِ مطلق، مؤثرِ حقیقی اور مسبّب الاسباب 'نظر' آنے لگے'، بالکل مفقود ہے۔ آخرت کا اقرار تو کیا جاتا ہے لیکن اس پر ایسا ایمان کہ "کُنْ فِی الدُّنیا کاَنَّکَ غَرِیبٌ اَوْعَابِرُ سَبِیلٍ"[1] کی کیفیت پیدا ہو جائے قطعاً ناپید ہے۔ رسالت کا اقرار تو ہے لیکن محبّتِ رسولؐ نام کو موجود نہیں اور مقامِ رسالت کا تصوّر زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو ڈاک کے ہرکارے اور صرف اپنی زندگی میں مِلّت کے مرکز یعنی رہبر و مطاع سے زیادہ نہیں اور جو سنّت کے مقام سے زیادہ آگاہ ہیں انہوں نے بھی سنّتِ عادت اور سنّتِ رسالت کی تقسیم سے ایسا چور دروازہ پیدا کر لیا ہے۔ جس سے کم از کم اپنی نجی زندگیوں کی حد تک زمانے کا ساتھ دینے کی آزادی برقرار رہے! گویا 'ایمان' کا صرف وہ اقرار پایا جاتا ہے جو قانونی اسلام کی بنیاد ہے اور یہ کیفیّت کہ ایمان انسان کا 'حال' بن جائے نہ صرف یہ کہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کی کسی ضرورت و اہمیّت کا احساس بھی سرے سے عنقا ہے۔!

---

[1] حدیثِ نبوی صلعم :۔ دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا مسافر!

[2] اس مکتب کی زوردار نمائندگی کا شرف ہمارے یہاں جناب غلام احمدؐ پرویز کو حاصل ہے۔ یہاں اس مکتبِ فکر کے حوالے سے صرف یہ مقصود ہے کہ واضح ہو جائے کہ یہ بھی تعبیر کی اصلاً اسی غلطی کی اگلی منزل ہے!

اسی نقطۂ نظر کا کرشمہ ہے کہ دین اسٹیٹ (STATE) کا ہم معنی قرار پایا ہے اور عبادت اطاعت کے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔ نماز کا یہ مقام کہ وہ معراج المومنین[1] ہے نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے اور نفسِ انسانی کا اس سے ایسا اُنس کہ "قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ"[2] کی کیفیت پیدا ہو سکے ناپید ہے۔ اس کے برعکس زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو صلوٰۃ معاشرے کے ہم معنی قرار پائی ہے اور دوسروں کے نزدیک بھی اس کی اصل اہمیت اس حیثیت سے ہے کہ وہ مسلمان معاشرے کی اصلاح اور تنظیم کا ایک جامع پروگرام ہے! زکوٰۃ کا یہ پہلو کہ یہ روح کی بالیدگی اور تزکیے کا ذریعہ ہے اس قدر معروف نہیں جتنی اس کی یہ حیثیت کہ یہ اسلامی نظامِ معیشت کا اہم ستون ہے۔ روزہ کے بارے میں یہ تو خوب بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ضبطِ نفس (SELF CONTROL) کی مشق و ریاضت ہے۔ لیکن اس کی اس حقیقت کا یا تو سرے سے ادراک ہی نہیں ہے یا اس کے بیان میں حجاب محسوس ہوتا ہے کہ یہ رُوح کی تقویت کا سامان اور جسدِ حیوانی کی اس پر گرفت کو کمزور کرنے کا ذریعہ ہے چنانچہ یہ حدیث تو تحریر و تقریر میں عام بیان ہوتی ہے کہ "الصَّوْمُ جُنَّةٌ"[3] اور اس کی تشریح پر خوب زور دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حدیثِ قدسی کہ "الصوم لی وانا اجزی بہ"[4] اوّل تو کم ہی بیان ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو بس سرسری طور پر[5]۔ اسی طرح حج کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ اس کے ذریعے "خدا پرستی کے محور پر ایک عالمگیر برادری" کی تنظیم ہوتی ہے لیکن اس سے آگے اس کی روحانی برکات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔!

اسلام کی یہ نئی تعبیر براہِ راست نتیجہ ہے مغرب کے فلسفہ و فکر کے ہمہ گیر تسلّط کا جس

---

[1] حدیثِ نبوی صلعم "الصلوٰۃ معراج المؤمنین": نماز مومنوں کی معراج ہے! [2] حدیثِ نبوی صلعم: میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے! [3] حدیثِ نبوی صلعم: "روزہ ڈھال کے مانند ہے" [4] حدیثِ قدسی: "روزہ میرے لیے ہے میں خود اس کی جزا دوں گا" یا ایک دوسری قرأت کے مطابق "روزہ میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا ہوں"۔ [5] واقعہ یہ ہے کہ اس حدیثِ قدسی کے صحیح مفہوم تک رسائی ایسے لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جن کے دل و دماغ پر مادیت کے پردے پڑے ہوتے ہیں!

نے نقطہ نظر کو ملحدانہ و مادّہ پرستانہ بنا کر رکھ دیا۔ نتیجتہً روح اور اس کی حیات باطنی خارج از بحث ہوگئی۔ اور مادّہ اور حیات دنیوی ہی سارے غور و فکر کا موضوع اور سوچ بچار کا مرکز بنے۔ چنانچہ دین و مذہب کی بھی مادّی تعبیر ہوئی اور کہنے میں تو اگرچہ یہ آیا کہ اسلام فلاح انسانی کا جامع پروگرام ہے جس میں فلاح اخروی اور فلاح دنیوی دونوں شامل ہیں لیکن نگاہیں چونکہ فی الواقع صرف حیات دنیوی پر مرکوز ہیں۔ لہٰذا آخری تجزیے میں اسلام ایک "سیاسی و عمرانی نظام" — (POLITICO -SOCIAL SYSTEM) بن کر رہ گیا — اور "الٰہیات" کی حیثیّت ایک "پردے" سے زیادہ نہ رہی[1]! چنانچہ زندگی کا اصل مقصد یہ قرار پایا کہ اس نظامِ زندگی کو عملاً رائج و نافذ کیا جائے۔ رہی خدا کی معرفت و محبّت اور اس کے سامنے تضرّع و اخبات جو 'عبادت' کا اصل جوہر ہیں تو ان کی حیثیّت بالکل ثانوی و اضافی ہو کر رہ گئی[2]۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع 'مذہبی' سے زیادہ 'سیاسی و عمرانی' اور 'دینی' سے زیادہ 'دنیوی' ہیں۔ اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی و معاشی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ اُن کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریّت یا

---

[1] چنانچہ اس دَور کے ایک بہت بڑے متکلّم اور داعئ اسلام کا یہ فقرہ ایک ثقہ راوی نے روایت کیا کہ "اسلام دراصل ایک سیاسی و عمرانی نظام ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے"۔ ع "چہ بے خبر ز مقام محمّدؐ عربی است"!

[2] یہ صورت حال بھی خاصی قدامت پسند 'اسلامی تحریکوں' کے یہاں ہے — ورنہ زیادہ 'ترقی پسند' لوگوں نے تو فکرِ مغرب کی منطقی انتہا یعنی سوشلزم اور کمیونزم کے زیر اثر اسلام کو سیاسی و عمرانی سے بھی آگے بڑھ کر محض ایک معاشی پروگرام بنا کر رکھ دیا ہے یعنی ان کے نزدیک اسلام عبارت ہے محض ایک مخصوص "نظام ربوبیت" سے باقی رہے اعتقادات و ایمانیات تو اُن کے ضمن میں جہاں سرسیّد مرحوم کی انتہا ہوئی تھی وہاں سے انہوں نے ابتدا کی اور جنت و دوزخ کی تعبیر اسی دنیا کے عیش و آرام اور کلفت و مشقت سے اور قیامت کی تعبیر ایٹمی دھماکوں سے کر کے سارا معاملہ ہی ختم کر دیا۔ تاہم باوجود اس کے کہ ہماری نگاہ میں یہ بھی اسلام کی مادّی تعبیر ہی کی 'منطقی انتہا' ہے۔ مذہب کی یہ تعبیر ہمارا موضوع بحث نہیں اس لیے کہ چاہے اسے "قرآنی فکر" ہی کا نام کیوں نہ دیا گیا ہو اس کا خالص مادّی اور خلافِ قرآن ہونا اظہر من الشّمس ہے اور ہم نے اس 'فکر' کی جانب کچھ اشارے کیے بھی ہیں تو محض ضمنی طور پر تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ دین و مذہب کی مادّی تعبیر کا سلسلہ بالآخر یہاں تک جاتا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج تا ثریّا مے رود دیوار کج !!!

اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور ان کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے ——— گویا درحقیقت مذہب کی اصل اقدار کے احیاء کا کام تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا ؎

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی کہ رُوحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتہ رہا اور نہ یہ ہی یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا ؎

ہم تو فانی جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

'احیائے اسلام' کی شرطِ لازم
'تجدیدِ ایمان'

اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا! مسلمان ممالک کی سیاسی آزادی و خود اختیاری بھی یقیناً بہت اہم ہے اور اس سے بھی ایک حد تک اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی راہ ہموار ہوئی ہے اسی طرح اسلامی نظامِ زندگی کا تصوّر اور اس پر ایک بہتر نظامِ حیات ہونے کے اعتبار سے اعتماد بھی ایک حد تک مفید اور قابلِ قدر ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ پیدا ہوا یا ہو رہا ہے ان کی سعی و جہد بھی احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے لیکن اصل اور اہم تر کام ابھی باقی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امر کی جانب متوجّہ ہوں اور جنہیں اس کی اہمیّت کا احساس ہو جائے وہ اپنی تمام تر سعی و جہد کو اس پر مرکوز کر دیں کہ امّت میں تجدیدِ ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کرے!

ایمان لامحالہ کچھ ماوراء الطبعیاتی حقائق پر یقین کا نام ہے۔ اور اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اُن دیکھی حقیقتوں پر دکھائی دینے والی چیزوں سے زیادہ یقین رکھے اور سر کے کانوں سے سُنی جانے والی باتوں سے کہیں زیادہ اعتماد ان باتوں پر کرے جو صرف دل کے کانوں سے سُنی جا سکتی ہیں۔ گویا "ایمان بالغیب" اس راہ کی شرطِ اوّلین ہے اور اس کے لیے فکر و نظر کا یہ انقلاب اور نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی یہ تبدیلی لازمی و لابدی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو۔ کائنات کا پورا سلسلہ نہ از خود قائم معلوم ہو نہ کچھ لگے بندھے قوانین کے تابع چلتا نظر آئے بلکہ ہر آن و ہر سمت ارادۂ خداوندی و مشیّت ایزدی کی کارفرمائی محسوس و مشہود ہو جائے۔ مادّہ حقیر و بے وقعت نظر آئے لیکن روح ایک حقیقتِ کبریٰ معلوم ہو۔ انسان کا اطلاق اس کے جسدِ حیوانی پر نہ ہو بلکہ اس رُوحِ ربّانی پر کیا جائے جس کی بدولت وہ مسجودِ ملائک ہوا[1] ——— حیاتِ دنیوی فانی و ناپائیدار ہی نہیں بالکل غیر حقیقی و بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اخروی ابدی و سرمدی اور حقیقی و واقعی نظر آنے لگے!! اور اللہ تعالےٰ کی رضا اور خوشنودی کے مقابلے میں دنیا و مافیہا کی وقعت حدیثِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلم کے مطابق مچھر کے پر سے زیادہ محسوس نہ ہو۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ جب تک اُمّت کے ایک قابلِ ذکر اور مؤثر حصّے میں نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی واقعۃً پیدا نہ ہو جائے "احیائے اسلام" کی آرزو ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔

عوام کی کشتِ قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے۔ جن کے قلوب و اذہان معرفتِ ربّانی و نورِ ایمانی سے منوّر، سینے کبر، حسد، بغض اور ریا سے پاک اور زندگیاں حرص، طمع، لالچ اور حُبِّ دنیا سے خالی نظر آئیں۔ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد ایسے ہی نفوسِ قدسیہ

---

[1] آیہ قرآنی: "فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ" ———
ترجمہ: جب میں اسے پوری طرح بنا چکوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو گر جانا اس کے لیے سجدے میں۔

کی تبلیغ و تعلیم، تلقین و نصیحت اور تربیت و صحبت کے ذریعے ایمان کی روشنی پھیلتی رہی ہے۔ اور اگرچہ جب سے مغرب کی الحاد و مادّہ پرستی کے زہر سے مسموم ہواؤں کا زور ہوا ایمان و یقین کے یہ بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے تاہم ابھی ایسی شخصیتیں بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے "دلِ روشن" نورِ یقین اور "نفسِ گرم" حرارتِ ایمانی سے معمور ہیں۔ اور اب ضرورت اس کی ہے کہ ایمان و یقین کی ایک عام رَو ایسی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحبِ عزیمت لوگ موجود ہوں جن کی زندگیوں کا مقصدِ وحید خدا کی رضاجوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو اور جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ مبارک کے مطابق کہ لَاَنْ يَّهْدِيَ بِكَ اللّٰهُ رَجُلًا وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ[1] خلق کی ہدایت و رہنمائی کو زندگی کا واحد لائحۂ عمل قرار دے لیں۔ اور اس کے سوا ان کی زندگی میں کوئی اور تمنّا، آرزو یا حوصلہ و اُمنگ باقی نہ رہے۔

خوش قسمتی سے برصغیر ہند و پاک میں ایک وسیع پیمانے پر ایسی حرکت پیدا بھی ہو چکی ہے جس کے زیرِ اثر عوام میں ایمان کی روشنی پھیل رہی ہے اور کائنات سے زیادہ خالقِ کائنات مادّے سے زیادہ رُوح اور حیاتِ دنیوی سے زیادہ حیاتِ اُخروی کی اہمیّت کا احساس اجاگر ہو رہا ہے۔ ہماری مراد جماعتِ تبلیغی سے ہے جسے بجا طور پر تحریکِ دیوبند کی ایک شاخ قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کی تاسیس کچھ ایسے اصحابِ ایمان و یقین کے ہاتھوں ہوئی ہے کہ آج ایک تہائی صدی[2] سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی، اور اس کے باوجود کہ اس کے طریقِ کار سے ہم کلیۃً اتفاق نہیں کرتے ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس کے زیرِ اثر لوگوں کے طرزِ فکر اور نقطۂ نظر میں ایک ایسی عمومی تبدیلی واقعۃً پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اصل حیثیت کائنات کی نہیں خالقِ کائنات کی ہے اور اصل اہمیّت اسباب کی نہیں مسبّب الاسباب کی ہے۔ بھوک غذا سے

---

[1] حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "اگر اللہ تعالےٰ تمہارے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے"۔

[2] اب اس تحریک کی عمر بھی نصف صدی سے تجاوز کر چکی ہے۔!

نہیں حکمِ خداوندی سے مٹتی ہے اور پیاس پانی سے نہیں اذنِ باری تعالےٰ سے بجھتی ہے۔ دین کے چھوٹے سے چھوٹے احکام انہیں کسی منطقی استدلال کی بنا پر یا کسی نظامِ زندگی کے اجزا یا اس کو قائم کرنے کے ذرائع کی حیثیت سے نہیں بلکہ فی نفسہٖ خیر نظر آنے لگتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی سے چھوٹی سنّتیں بجائے خود نورانی معلوم ہونے لگتی ہیں اور زندگی اور اس کے لوازمات کے باب میں کم از کم پر قناعت کر کے وہ اپنے اوقات کا معتدبہ حصّہ ایک مخصوص طریق پر تبلیغ و اشاعت دین کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

لیکن چونکہ اس تحریک میں اصل تخاطب عقل سے نہیں جذبات سے ہے اور اس کی اصل اساس علم پر نہیں عمل پر ہے۔ لہٰذا اس کے اثرات محدود ہیں اور معاشرے کے وہ طبقے جن کے یہاں جذبات پر عقل اور عمل پر علم کو اوّلیت حاصل ہے اس سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ اپنی ذہنی ساخت کی بنا پر مجبور ہوتے ہیں کہ عقل کی جملہ وادیاں طے کر کے عشق کی وادی میں قدم رکھیں اور خرد کی تمام گتھیاں سُلجھانے کے بعد صاحبِ جنون ہوں۔ پھر یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اسی قسم کے لوگ ہر دَور اور ہر معاشرے کی وہ ذہین اقلیت (INTELLECTUAL MINORITY) ہوتے ہیں جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پُوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبدیلی اور ان کے فکر و نظر کے انقلاب کو اوّلین اہمیّت حاصل ہے ——— اور اگر خدانخواستہ ایمان ان لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہ ہو سکا۔ اور انہیں جہالت و جاہلیّت کی ظلمتوں سے نکالا نہ جا سکا تو صرف عوام النّاس کے قلوب و اذہان کی تبدیلی سے کسی مؤثر اور پائیدار تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

کرنے کا اصل کام

بنا بریں وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اُٹھے

جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات اور معاشرے کے ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دے ——— اور انہیں مادیت و الحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی میں لے آئے اور خدا پرستی و خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔ خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلّل اثبات اور الحاد و مادّہ پرستی کے پُرزور ابطال کے بغیر اس مہم کا سر ہونا محال ہے۔ اساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ چونکہ موجودہ دَور میں فاصلے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور پُوری نوع انسانی ایک کنبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ لہٰذا علمی سطح کا تعیّن کسی ایک ملک کے اعتبار سے نہیں بلکہ پُوری دنیا کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق کرنا ہوگا ——— اور اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ کام انتہائی کٹھن اور سخت محنت طلب ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس کے بغیر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔

پیشِ نظر علمی تحریک کے لیے سب سے پہلے ایسے ذہین اور باصلاحیّت نوجوانوں کو تلاش کرنا ہوگا۔ جن میں علم کی ایک شدید پیاس فطری طور پر موجود ہو۔ جن کے قلوب مضطرب اور روحیں بے چین ہوں۔ جن کو خود اپنے اندر یہ احساس موجود نظر آئے کہ اصل حقیقت حواس کی سرحدوں سے بہت پرے واقع ہے اور جن میں حقیقت کی تلاش و دریافت کا داعیہ اتنا شدید ہو جائے کہ وہ اس کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں اور آرام و آسائش کے حصُول اور خوشنما مستقبل (CAREERS) کی تعمیر سے یکسر بے نیاز ہو جائیں۔

ایسے نوجوانوں کو اوّلاً انسان کی آج تک کی سوچ بچار کا مکمّل جائزہ لینا ہوگا اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ انسانی فکر کی پُوری تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس اعتبار سے منطق، ماورا الطبیعات، نفسیات، اخلاقیات اور روحانیات ان کے مطالعہ اور غور و فکر کا اصل میدان ہوں گے۔ (اگرچہ ضمنی طور پر عمرانیات اور طبعیات کی ضروری معلومات کی تحصیل بھی ناگزیر ہوگی) فکرِ انسانی کے اس گہرے اور تحقیقی مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ

وحیِ آسمانی اور اس کے آخری جامع اور مکمل ایڈیشن یعنی قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ حقیقت کی تلاش اور حقیقت نفس الامری کی دریافت کے نقطۂ نگاہ سے کریں۔

> پھر اگر ایسا ہو کہ قرآن کی روشنی ان پر واضح ہو جائے، اس کا پیغام انہیں اپنی فطرت کی آواز معلوم ہو، اس کے نور سے ان کے قلوب و اذہان منوّر ہو جائیں آفاق و انفس کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں تمام بنیادی سوالوں کا تشفی بخش جواب انہیں مل جائے، اور انبساطِ معرفت سے ان کے نفوس میں امن اور سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ تو اسی کا نام ایمان ہے۔!

پھر یہی ہوں گے جنہیں "رسوخ فی العلم" حاصل ہو گا۔ جن کا علم ذہنی و اخلاقی آوارگی کے بجائے تقویٰ و خشیتِ الٰہی پر منتج ہو گا جن کی شخصیتیں "اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا"[1] کی مجسم تفسیر اور "ع قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن" کی عملی تصویر ہوں گے اس لیے کہ قرآن کا "مغز" دراصل یہی علم حقیقت ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ قانون و شریعت کی اہمیت بجائے خود اگرچہ نہایت عظیم ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ان کی حیثیت واقعۃً "استخواں" کی ہے[2]! اور حقیقت یہ ہے کہ اس کیفیتِ ایمانی کی تحصیل کے بغیر قرآن کے بیان کردہ قانون و شریعت پر غور و فکر بالکل بے کار ہے۔ یہی رمز ہے جو حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں بیان ہوا کہ تَعَلَّمْنَا الْاِيْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْاٰنَ[3]

مغرب کے فلسفہ و فکر کے مؤثر ابطال اور اس کی تہذیب و تمدن کے واقعی استیصال کا کٹھن کام صرف ان لوگوں کے بس کا ہے جو "علم حقیقت" کے ان چشموں سے اچھی طرح سیراب

---

[1] آیت قرآنی: "اللہ کی خشیت اس کے اہل علم بندوں ہی کے دلوں میں گھر کرتی ہے۔"
[2] ما ز قرآں مغز را برداشتیم ۔ استخواں پیشِ سگاں انداختیم (رومی)
[3] ترجمہ: "ہم نے پہلے ایمان سیکھا اور پھر قرآن۔"

ہوں جو قرآن حکیم کی آیات بیّنات کی صورت میں رواں ہیں' ان ہی کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ آج کے فلاسفہ کے لیے ایک نئی "تہافت"[1] تصنیف کرسکیں اور آج کے منطقیین پر از سرِنو "رد"[2] کر سکیں' اور فی الجملہ الحاد و مادّہ پرستی کے اس سیلاب کا رُخ پھیر دیں جو تقریباً دو صدیوں سے ذہنِ انسانی کو بہائے لیے چلا جا رہا ہے۔

اس تخریب کے ساتھ انہیں جدید علم الکلام کی تاسیس کا مثبت کام بھی کرنا ہوگا تاکہ ریاضی' طبعیات' فلکیات' حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں جن حقائق کی دریافت آج تک ہوئی ہے[3] اور جو اسی حقیقتِ کُلّی کی ادنیٰ جزئیات ہیں جن کا مظہرِ اتم ایمان ہے۔ انہیں اسلامی عقائد کے نظام میں اپنے اپنے مقام پر صحیح طور سے فٹ کیا جا سکے۔ آج سے پینتیس چالیس سال قبل علاّمہ اقبال مرحوم نے "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصّہ تو اگرچہ بہت محلِّ نظر ہے جو شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور جو فی الواقع "الٰہیات" سے براہِ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علاّمہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی اور جیسا کہ خود علاّمہ نے کتاب کے دیباچے میں فرمایا تھا کہ ——— "ہوسکتا ہے کہ جیسے جیسے علم آگے بڑھے اور فکر کی نئی راہیں کھلیں' زیرِ نظر کتاب میں جو خیالات بیان ہوئے ہیں' ان کے علاوہ بلکہ ان سے صحیح تر خیالات ظاہر ہوں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانی فکر کے ارتقاء کا ایک آزاد تنقیدی نقطۂ نگاہ سے مسلسل جائزہ لیتے رہیں ......" اگر انہی خطوط پر کام جاری رہتا اور کچھ باہمت لوگ اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تو ایک بہت وقیع و قابلِ قدر کام ہو جاتا لیکن افسوس کہ خود علاّمہ مرحوم کے حلقہ اثر میں سے بھی کسی نے اس میدان کو اپنی جولانیٔ طبع کے لیے منتخب نہیں کیا۔!

---

[1] تہافت الفلاسفہ۔ تالیف امام غزالیؒ

[2] الرّد علی المنطقیین۔ تالیف امام ابن تیمیہؒ

[3] واضح رہے کہ اس ضمن میں "حقائق" اور "نظریات" کے مابین فرق و امتیاز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

بہرحال جب تک اس میدان میں واقعی قدر و قیمت رکھنے والا کام ایک قابلِ ذکر حد تک نہیں ہو جاتا یہ اُمید کہ معاشرے کے ذہین طبقات کو مذہب کی طرف راغب کیا جا سکے گا محض سراب کا درجہ رکھتی ہے ——!

"الٰہیات اسلامیہ کی تشکیلِ جدید" کے بعد دوسرا اہم کام یہ ہے کہ حیاتِ دنیوی کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاست و قانون اور معاشرت و معیشت کے باب میں اسلام کی ہدایت و رہنمائی کو مدلّل و مفصّل واضح کیا جائے۔ اس ضمن میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے پچھلے پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں خاصا کام مصر اور برّصغیر ہند و پاک میں ہوا ہے خصوصاً جماعتِ اسلامی اور الاخوان المسلمون نے۔ "اسلامی نظامِ حیات" اور "عدالتہ الاجتماعیہ فی الاسلام" کو تصنیف و تالیف کا مرکزی موضوع بنایا ہے تاہم اس سارے کام کو بس ایک اچھی ابتدا قرار دیا جا سکتا ہے اور ادھر کچھ عرصہ سے مکھی پر مکھی مار دینے اور تقریباً ایک سی سطح اور ایک سے معیار کی تالیفات مختلف ناموں سے شائع کر دینے کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس نے بہت حد تک اس اساسی کام کی اہمیّت بھی ختم کر دی ہے جو بجائے خود خاصا قابلِ قدر تھا۔ اس ضمن میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ نیم خواندہ یا بقول مولانا اصلاحی "پڑھے کم لکھے زیادہ" لوگوں کی تصنیفات و تالیفات کی ایک خاص تکنیک کے ذریعے ایک مخصوص حلقے میں فروخت سے بعض لوگوں کا معاشی مسئلہ تو ضرور حل ہو سکتا ہے، دین کی کوئی مثبت اور پائیدار خدمت ممکن نہیں ہے۔ آج کی دنیا میں خصوصاً اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ مسلّمہ علمی قابلیّت رکھنے والے لوگوں کے سوا کسی مؤلف و مصنف کی جانب التفات کر سکیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ معیاری ہو اور کمیّت سے زیادہ کیفیّت پیشِ نظر رہے۔

اس کام کے لیے بھی ظاہر ہے کہ ایک طرف موجودہ دنیا کے مسائل و معاملات کا صحیح فہم اور عمرانیات کے مختلف میدانوں میں جدید رجحانات کا براہِ راست علم ضروری ہے۔

اور دوسری طرف قرآن وسنّت میں گہری ممارست لازمی ہے اور جب تک یہ صورت نہ ہو کہ ان دونوں اطراف کا مطالعہ یکساں دِقّتِ نظر کے ساتھ کیا جائے معیاری نتائج کی توقع عبث ہے۔

عملی اقدامات

متذکرہ بالا علمی تحریک کے اجرا کے لیے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں۔

ایک یہ کہ عمومی دعوت وتبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو ایک طرف تو عوام کو تجدید ایمان اور اصلاحِ اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی وفکری اور اخلاقی وعملی تربیّت کا بندوبست کرے[1] اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیّت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے آرزُومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے جو پیشِ نظر علمی کام کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں۔ آج کے دور میں، جبکہ مادّیت اور دنیا پرستی کا قلوب واذہان پر مکمل تسلّط ہے اور کچھ تو فی الواقع طلبِ معاش کا مسئلہ اتنا کٹھن ہو گیا ہے کہ اکثر لوگوں کو اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اسی کے حل پر مرکوز کر دینی پڑتی ہیں۔ پھر معاشرے کا عام رجحان یہ ہو گیا ہے کہ جو ذرا اس سطح سے بلند ہوتا ہے اس پر معیارِ زندگی کو بلند تر کرنے کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے نوجوانوں کا ملنا بظاہر محال نظر آتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا سعید روحوں سے کبھی خالی نہیں ہوئی اور اگر کچھ مخلص وصاحبِ عزیمت لوگ ذہنی یکسوئی کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھالیں تو انشاء اللہ اسی معاشرے میں بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک نوجوان ایسے مل جائیں گے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کو کہ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ[2] اپنا لائحہ عمل بنا کر علمِ قرآن کی تحصیل واشاعت کے لیے زندگی وقف کر دیں —

---

[1] الحمدللہ کہ ان مقاصد کے لیے ۱۹۷۵ء میں "تنظیم اسلامی" کا قیام عمل میں آگیا

[2] حدیثِ نبوی صلعم: "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔"

یہ بھی واضح رہے کہ اصل ضرورت صرف اس کی ہوتی ہے کہ کسی جذبہ وخیال کے تحت انسان میں داخلی طور پر ایک داعیہ بیدار ہو جائے، پھر یہ داعیہ کام کی راہیں خود پیدا کر لیتا ہے اور تمام موانع ومشکلات سے خود نبٹ لیتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ اس خیال کو عام اور اس کی ضرورت کے احساس کو اُجاگر کیا جائے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس اعلیٰ وارفع نصب العین کے لیے کام کرنے والے دستیاب نہ ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ ایک قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے ——— جو ایک طرف علوم قرآنی کی عمومی نشر واشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علوم جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم وحکمت سے بھی براہِ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

علوم قرآنی کی عمومی نشر واشاعت کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ عام لوگوں کی توجہات قرآن حکیم کی طرف مرکوز ہوں گی، ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہو گا، دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہو گی اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو گا۔ نتیجۃً بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد ایسے نوجوانوں کی نہ نکل آئے جو اس کی قدر وقیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی کو اس کے علم وحکمت کی تحصیل اور نشر واشاعت کے لیے وقف کر دیں۔ ایسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہو گا، اور اس کے لیے ضروری ہو گا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآن حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے اور ساتھ ہی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جائے ——— پھر ان میں سے جو لوگ فلسفہ

(بقیہ صـــ۶۳ پر)

ڈاکٹر محمد رفیع انصاری

منشورِ اسلام

(۴)

۷۔ نوع میں نصب العینوں کا ارتقا

نصب العین کی محبت کا جذبہ نوع میں بھی شروع سے ہی اپنا اظہار کرنے لگ جاتا ہے۔ نوعِ انسانی میں بھی نصب العینوں نے قریباً اسی ترتیب کے ساتھ ارتقا کیا ہے جس ترتیب کے ساتھ وہ فردِ انسانی میں ارتقا کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ فردِ زندگی کی نفسیاتی سطح پر بھی نوع کی تاریخ کا اعادہ اسی طرح سے کرتا ہے جس طرح وہ زندگی کی حیاتیاتی سطح پر اس کا اعادہ کرتا ہے۔

عہدِ قدیم کے انسان کے لیے اس کی اپنی جبلتی خواہشات (مثلاً بھوک کی تشفی کرنا، دوسروں پر غلبہ حاصل کرنا، اشیاء کا مالک بننا، جنسی خواہش کو مطمئن کرنا وغیرہ) سے زیادہ کوئی چیز محبت کرنے اور ستائش کرنے کے لائق نہ تھی۔ ہر شخص کی ہمدردیاں صرف اس کی اپنی ذات تک محدود ہوتی تھیں۔ الّا یہ کہ وہ بعض وقت اپنی حیوانی جبلتوں ہی کی خاطر ان کو دوسرے اشخاص تک وسعت دینے کے لیے مجبور ہو جائے۔ پھر کچھ مدت کے بعد وہ اپنے خاندان کے افراد سے ایک قسم کی دلچسپی اور کشش محسوس کرنے لگا اور اسے دوسرے خاندانوں سے الگ ایک وحدت سمجھنے لگا جو اس کے نزدیک خاندان کے سب سے بڑے بزرگ اور دانا کے تحت قدرتی طور پر منظم تھی اور یہ بزرگ یا دانا خاندان کا سردار تھا۔ اس مرحلہ پر اپنی سود و بہبود کی بجائے خاندان کی سود و بہبود اس کا مقصود یا نصب العین بن گئی اور چونکہ خاندان کا سردار خاندان کی سود و بہبود

کا نگران تھا وہ اس کی خوشنودی کے لیے اپنی جبلّتی خواہشات میں جو پہلے اس کا مقصود تھیں ردّوبدل کو گوارا کرنے لگا۔ اس کے بعد اُس نے اپنے خاندان کے بعض مفاد کو قبیلہ کی عام بھلائی کے لیے قربان کرنا سیکھ لیا اور یہ قبیلہ جس کی علامت اس کا سردار تھا، اس کی محبّت کا مقصود یا نصب العین بن گیا۔ پھر قبیلے بہت سے تھے اور آپس میں جنگ کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا آخر کار ان کو یہ بات سمجھ میں آئی کہ قبائلی جنگیں ظالمانہ اور تباہ کن ہیں اور ان کی آرزوئے حسن کے لیے یہ بات زیادہ تسلّی بخش ہے کہ وہ ایک بادشاہ کے ماتحت متحد اور منظم ہو جائیں۔ لہٰذا اب بادشاہ ایک خاص ملک میں رہنے والی ایک قوم پر حکومت کرنے لگا۔ اور قوم کے نمائندہ کی حیثیّت سے قوم کا مقصود اور نصب العین بن گیا لیکن بادشاہ کی خود غرضیوں اور بے انصافیوں نے ان کی توجہ جلد ہی اس بات کی طرف مبذول کر دی کہ درحقیقت ان کی آرزوئے حسن کو ایسا نصب العین مطمئن نہیں کر سکتا جو ملک اور قوم کی خیر خواہی اور بھلائی کو نظر انداز کرتا ہو۔ لہٰذا ان کا نصب العین بادشاہ کی بجائے ملک یا ملک میں رہنے والی قوم قرار پایا۔ دوسرے الفاظ میں ان کا نصب العین ایک فرد واحد کی عظمت سے جو ظل اللہ سمجھا جاتا تھا، گزر کر پوری قوم کی عظمت پر آ ٹھہرا اور اس نے بادشاہت پرستی کی بجائے قومیت پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ پھر قوم کی بھلائی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے آپ پر خود حکومت کرے۔ لہٰذا ان کا نصب العین حسن کے معیار میں اور بلند ہو گیا اور وہ جمہوریت، آزادی، اخوت، مساوات اور حریت ایسے ناموں سے تعبیر ہونے لگا۔ تاہم ان اصطلاحات کا مفہوم زیادہ وسیع نہیں تھا۔ کیونکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کا اطلاق انسانوں کے ایک محدود گروہ پر کیا جائے جو ایک قوم یا نسل کی حیثیت سے ایک خاص خطۂ زمین میں خاص جغرافیائی حدود کے اندر رہتے ہوں اور فقط وہی ان سے مستفید ہوں لیکن پہلی جنگِ عظیم کے بعد نوعِ انسانی کے نصب العینوں نے ایک نہایت ہی اہم قدم آگے اُٹھایا یعنی وہ انسان اور کائنات کے مکمل فلسفوں کی صورت میں آ گئے۔ مثلاً فسطائیت اور اشتراکیت جن میں سے ہر ایک کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہونے کا مدعی ہے۔

فرد کی طرح نوع میں بھی نصب العینوں کا ارتقا ٹھوس اشیاء سے تصوری حقائق کی سمت میں، غیر مستقل سے مستقل کی سمت میں، غیر مکمل سے مکمل کی سمت میں، متعدد سے واحد کی سمت میں،

جزو سے کل کی سمت میں اور حسن نیکی اور صداقت کے پست درجوں سے ان کے بلند تر درجوں کی سمت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں فرد کے نصب العینوں کی طرح وہ بھی صحیح نصب العین کی سمت میں ارتقا کرتے ہیں۔

قائدین کا رول

عام طور پر ایک نصب العین کے حسن کا ذاتی احساس کسی ایسے قائد یا راہ نما کے ساتھ گہرا نفسیاتی یا روحانی تعلق پیدا کرنے سے حاصل ہوتا ہے جو اس نصب العین کی محبت سے پوری طرح سرشار ہو۔ اس قسم کا نفسیاتی تعلق ایسی حالت میں بھی بہت آسانی سے پیدا کیا جا سکتا ہے جب کسی انسان کو ایک ایسی معاشرتی فضا میں رہنے کا اتفاق ہو جو نصب العین کی محبت سے پوری طرح معمور ہو یعنی ایک ایسے معاشرہ میں جس کے افراد پہلے ہی اس نصب العین سے محبت کر رہے ہوں اور اس کی خدمت میں مصروف ہوں۔ یہی وہ طریق ہے جس سے ہماری کسی نظریاتی سوسائٹی کی ایک نسل کا نصب العین اس سے اگلی نسل کا نصب العین بن جاتا ہے۔ ایک نصب العین کے چاہنے والے کے ساتھ نفسیاتی تعلق پیدا کرنا واحد طریق کار ہے جس کے ذریعہ سے ایک انسان نصب العین کی محبت میں اضافہ کر کے اس کو زیادہ قوی اور اس کی کیفیت کو اور گہرا کر سکتا ہے۔

تمام نصب العینوں کے خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط قائدین بھی ہوتے ہیں اور متبعین بھی۔

ایک تہذیب کا عروج و زوال

جس طرح سے ضروری ہے کہ ایک فرد کا غلط نصب العین زود یا بدیر شکستہ ہو جائے اسی طرح سے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک منظم جماعت کا نصب العین بھی زود یا بدیر شکستہ ہو جائے۔ وہ کئی صدیوں تک زندہ رہ سکتا ہے لیکن آخر کار اس کا مٹ جانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک نصب العین فقط ایک ذہنی تصور ہی نہیں ہوتا بلکہ عمل کا ایک پروگرام بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا ہر چھوٹے سے چھوٹا حصہ اس کی پرستار سوسائٹی کی خارجی عملی زندگی میں منتقل ہوتا ہے۔ لہٰذا سوسائٹی کی عملی زندگی کے حالات اس کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ نصب العین کی باطنی جزئیات

سوسائٹی کے حالات میں اس طرح ہو بہو نظر آتی ہیں جس طرح ایک بڑے آئینے میں اس کے سامنے کے منظر کی تفصیلات۔ یہ حقیقت سوسائٹی کو موقعہ دیتی ہے کہ وہ اس کے نقائص کو بڑی ضلاحت کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ اگر نصب العین غلط ہو تو غلط قسم کے سماجی، اخلاقی، اقتصادی، سیاسی، قومی اور بین الاقوامی حالات پیدا کرتا ہے جو حسن، نیکی اور صداقت کے لیے ہماری فطری آرزو کو ناگوار ہوتے ہیں اور ہمیں نصب العین کے نقائص سے خبردار کرتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں اس کی نفرت پیدا کرتے ہیں اور ہمیں اسے چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔

وہ سوسائٹی جو ایک غلط نصب العین سے محبّت کرتی ہو۔ اُس نصب العین کی طرف خدا کی چند صفات کو تو اپنی غلطی کی وجہ سے جان بوجھ کر اور شعوری طور پر منسوب کرتی ہے اور خدا کی باقی صفات کو نہ جانتے ہوئے اور غیر شعوری طور پر منسوب کرتی ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام کوششوں کو ان صفات کے عملی خارجی اظہار پر صرف کرتی ہے جن کی موجودگی کا وہ اپنی غلطی کی وجہ سے یہ سمجھتی ہے کہ وہ علم رکھتی ہے اور باقی صفات کو نظر انداز کرتی ہے اور ان کے عملی اظہار کی کوئی کوشش نہیں کرتی۔ لیکن یہی بات کہ وہ خدا کی اکثر صفات کو نظر انداز کرتی ہے اس کے لیے ناممکن بنا دیتی ہے کہ وہ خدا کی ان صفات کو اپنی خارجی عملی زندگی میں کامیابی سے ظاہر کر سکے جن کو وہ نظر انداز کرنا نہیں چاہتی۔ چونکہ وہ حسن، نیکی اور صداقت کی اکثر ضروریات سے بے پرواہ ہوتی ہے لہٰذا یہ حقیقت حسن، نیکی اور صداقت کی ان ضروریات سے مزاحمت کرتی ہے اور ان کی تشفی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے جن سے وہ بے پرواہ نہیں ہوتی۔ ایک غلط نصب العین کی فطرت کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ اس سوسائٹی کے حالات جو اس پر مبنی ہوں آخر کار زیادہ سے زیادہ بگڑتے چلے جائیں یہاں تک کہ وہ سوسائٹی اپنی آخری تباہی تک پہنچ جائے اور ایسا ہو کر رہتا ہے خواہ سوسائٹی کے افراد بگڑتے ہوئے حالات کی روک تھام یا اصلاح کے لیے جو چاہیں کہتے یا کرتے رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر غلط نصب العین یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا کی چند صفات کو اس کی باقی ماندہ صفات سے الگ کر کے اور ان کی مدد کے بغیر سوسائٹی کی عملی زندگی میں آشکار کرے۔ حالانکہ حسن کی کوئی صفت اس کی دوسری تمام صفات کی مدد کے بغیر اور ان سے الگ ہو کر اپنا اظہار نہیں پا سکتی۔ حسن جس میں نیکی اور صداقت بھی شامل ہیں ایک وحدت ہے وہ نہ

تو حصّوں میں تقسیم ہوسکتا ہے اور نہ حصّوں میں آشکار کیا جا سکتا ہے۔

لیکن وہ عمل جس سے غلط نصب العین پر قائم ہونے والی ایک سوسائٹی اپنے نصب العین کے بیکار بلکہ خطرناک ہونے کا علم حاصل کرتی ہے بالعموم بڑا سُست اور طویل ہوتا ہے اور کئی صدیوں تک پھیل جاتا ہے۔ ابتدائے عشق میں نصب العین کے چاہنے والوں کی امیدیں بہت بلند ہوتی ہیں۔ ان کی محبّت تازہ اور پُرجوش ہوتی ہے لہٰذا وہ اپنے نصب العین کی خدمت دل و جان سے کرتے ہیں اور اس کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے کہ وہ جس حسن کو اپنے نصب العین کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ خارجی دنیا میں آشکار ہو۔ اس سے ان کی محبّت اور بھی ترقی کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نصب العین کی قوّت بڑھتی رہتی ہے اس کا حلقۂ اثر پھیلتا رہتا ہے اور اس کی شان و شوکت میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ نصب العین عظمت کی اس انتہا کو پالیتا ہے جسے پالینے کی استعداد اس کی فطرت میں ہوتی ہے۔ قدرت ہر نصب العین کو بڑھنے اور پھُولنے کا پورا موقعہ دیتی ہے اور ہر نصب العین ہر سمت میں اور ہر پہلو سے اتنی نشو و نما پالیتا ہے جتنی اس کی فطرت کی صلاحیتوں میں یا اس کے اوصاف و خواص میں بالقوہ موجود ہوتی ہے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا

ہم سب کی مدد کرتے ہیں ان کی بھی اور ان کی بھی۔ آپ کے رب کی بخشش کی وجہ سے اور آپ کے رب کی بخشش محدود نہیں۔ (بنی اسرائیل :۔ ۲۰)

لیکن رفتہ رفتہ نصب العین کے پوشیدہ نقائص ان کی محبّت پر مخالفانہ اثر پیدا کرنے لگ جاتے ہیں۔ وہ اب بھی اپنے نصب العین سے چمٹے رہتے ہیں لیکن اس کے لیے ان کی تمنّا کا جذبہ کمزور ہونے لگتا ہے اور ان کی محبّت کا جوش و خروش بھی ٹھنڈا ہونے لگتا ہے اور اب نصب العین پھیلنے سے رہ جاتا ہے اور اس کی قوّت ترقی کرنے سے رک جاتی ہے اور وہ اسی قوّت اور شان و شوکت کے سہارے جیتا ہے جو وہ پہلے حاصل کر چکا ہوتا ہے اور روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتا جاتا ہے لہٰذا اس کے چاہنے والے بھی دن بدن اس کے لیے اپنی محبّت کھوتے جاتے ہیں۔ اس موقعہ پر ایک بیرونی کچل دینے والا حملہ یا ایک اندرونی کامیاب انقلاب

اسے ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ اور ایک اور نصب العین اس کی جگہ لینے کیلئے اُبھر آتا ہے۔ یہ ہے قدرت کا وہ عمل جس کے ذریعہ سے ثقافتیں اور تہذیبیں جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی نصب العین کے گرد وجود میں آتی ہے ترقی کرتی ہیں اور اپنی ترقی کی انتہا تک پہنچ جاتی ہیں اور پھر زوال پاتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں اور نئی ثقافتیں اور تہذیبیں ان کی جگہ لیتی ہیں اور پھر تاریخ کے اسی عمل کو دہراتی ہیں اور یہ ہے قدرت کا وہ قانون جس سے تاریخ کا عمل انسان کو اس کی فطرت کے نصب العین کی طرف جو نوع انسانی کا آخری نصب العین ہے آگے دھکیلتا چلا جا رہا ہے۔

اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَبْلِھِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَکِّنْ لَّکُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْھِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْھٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمْ فَاَھْلَکْنٰھُمْ بِذُنُوْبِھِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِھِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ۔ (الانعام: ۶)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی نسلوں کو تباہ کر دیا ہے جن کو ہم نے زمین پر اس طرح سے تمکن کیا تھا کہ تم کو بھی ویسا نہیں کیا۔ ہم نے بادلوں کو بھیجا کہ ان پر موسلا دھار مینہ برسائیں اور دریاؤں کو ان کے نیچے جاری کیا اور ہم نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب سے نیست و نابود کر دیا اور اُن کے بعد ایک اور نسل پیدا کی۔

نصب العینوں کی جنگ

چونکہ کسی قوم کا نصب العین ایک ایسا تصوّر ہوتا ہے جو اس کے اپنے خیال کے مطابق انتہائی حسن اور انتہائی کمال سے مزیّن ہوتا ہے اور وہ قوم چاہتی ہے کہ اپنے نصب العین کے حسن اور کمال کو پوری طرح سے آشکار کرے لہٰذا وہ اس کام کو بخیر و خوبی انجام دینے کے لیے اپنے آپ کے لیے غیر محدود قوت اور حلقۂ اثر کی غیر محدود وسعت چاہتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ غیر محدود قوت اور غیر محدود حلقۂ اثر صرف دوسرے تمام نصب العینوں کی قیمت پر ہی اور ان کو نقصان پہنچا کر ہی حاصل کر سکتی ہے۔ لہٰذا ہر ریاست بالقوہ اور اپنی فطرت کی بنا پر دوسری

تمام ریاستوں کی دشمن اور بدخواہ ہوتی ہے اور جس لمحہ وجود میں آتی ہے اسی لمحہ سے اُن سب کے ساتھ برسرِ پیکار ہوتی ہے۔ یہ پیکار کبھی آشکار ہوتی ہے اور کبھی پنہاں۔ کبھی تشدّد آمیز ہوتی اور کبھی پُرامن کبھی میدان جنگ کی صورت اختیار کرتی ہے اور کبھی مجلس یا کانفرنس کی اور کبھی کسی عہد نامہ کی یا خیر سگالی کے جذبہ کی۔ لیکن یہ پیکار ہر ریاست کے لیے زندگی اور موت کی جنگ ہوتی ہے جو اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ وہ خود مٹ نہیں جاتی یا دوسری تمام ریاستوں کو مٹا نہیں دیتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس پیکار کے باوجود بعض ریاستوں میں مشترک مقاصد حاصل کرنے کے لیے گہری دوستیاں پیدا ہو جائیں جو طویل عرصوں تک جاری رہیں۔ لیکن ریاستوں کی ایسی دوستیاں صرف اس وقت تک جاری رہتی ہیں جب تک ان کے نصب العینوں کے مفاد ایک دوسرے سے کھلم کھلا نہیں ٹکراتے تاہم ان کے مفاد کا مخفی تضاد ہمیشہ موجود رہتا ہے اور ان کی زندگی میں بار بار آشکار ہوتا رہتا ہے۔

اس طرح ہر غلط نصب العین زود یا بدیر ٹوٹ جاتا ہے۔ نہ صرف اس لیے کہ اس کے مخفی اندرونی تضادات یا نقائص آشکار ہو کر اسے توڑ دیتے ہیں۔ بلکہ اس لیے بھی کہ دوسرے نصب العینوں کو ماننے والی قومیں اسے باہر سے کاری ضربیں لگا کر کچل دیتی ہیں۔ جب کسی نصب العین کو ماننے والی قوم بیرونی حملوں کی وجہ سے کمزور ہو جاتی ہے تو وہ اس بات پر غور کرنے لگتی ہے کہ آیا اس کا نصب العین ہی تو اس کی شکستوں اور ناکامیوں کا باعث نہیں۔ گویا ایسی حالت میں اگر نصب العین درحقیقت غلط اور ناقص ہو تو قوم اس کے نقائص سے جلد تر باخبر ہو جاتی ہے۔

جذبۂ لاشعور کی حقیقت

نصب العین کی محبّت کا جذبہ جو انسان کا امتیاز ہے درحقیقت اس کے لاشعور کا جذبہ ہے جو تجزیہ نفس کے ماہرین کے تجربات کے نتیجہ کے طور پر اب انسان کے تمام اعمال و افعال کی قوت محرکہ تسلیم کیا گیا ہے افسوس ہے کہ تجزیہ نفس کے ماہرین نے جذبہ لاشعور کی حقیقت کو پوری طرح سے نہیں سمجھا اور اس کی کئی متضاد قسم کی توجیہات کی ہیں۔ مثلاً فرائڈ کے خیال میں یہ جذبہ جنسی خواہش ہے۔ ایڈلر کا خیال ہے کہ اس کی حقیقت قوت یا غلبہ کی ایک خواہش ہے اور یونگ سمجھتا ہے کہ یہ جنسی خواہش بھی ہے اور جذبہ کی خواہش بھی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ جذبہ حسن اور کمال کی ایک

خواہش ہے جو کسی ایسے نصب العین کی محبت سے ہی مطمئن ہو سکتی ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو چونکہ اس قسم کا ایک نصب العین یہ استعداد رکھتا ہے کہ انسان کے لاشعور میں محبت کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ اسے تمام و کمال اپنے تصرف میں لے لے اور کام میں لائے۔ وہ انسان کی شخصیت کو مکمل طور پر متحد اور منظم کر دیتا ہے اور اس کے مکمل اطمینانِ قلب اور انبساط کا موجب ہوتا ہے۔ یہ حقیقت نہ صرف دماغی اور اعصابی امراض کے انسداد اور علاج کے لیے اور اخلاقی بیماریوں کو روکنے اور دُور کرنے کے لیے بلکہ نوع انسانی کی معاشرتی اور سیاسی مشکلات کے حل کرنے کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

محبّت کی یا اپنے آپ کے علم کی ترقی اور اس کا تنزّل

ایک نصب العین کی محبت جب تک عمل میں ظاہر نہ ہو وہ سچی محبت نہیں ہوتی بلکہ محض خود فریبی ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جس حد تک کسی شخص کی زندگی کے اعمال و افعال اس نصب العین سے پیدا نہیں ہو رہے ہوتے جس کی محبّت کا وہ دعویٰ زبانی کر رہا ہے وہ یقیناً کسی اور نصب العین سے پیدا ہو رہے ہوتے ہیں اور وہی نصب العین درحقیقت اس کے دل پر قابض ہوتا ہے اور اس کا زبانی دعویٰ غلط ہوتا ہے۔

کسی نصب العین کی سچّی اور حقیقی محبّت کبھی ایک حال پر نہیں رہتی۔ وہ کم و بیش یا تو بڑھ رہی ہوتی ہے یا کم ہو رہی ہوتی ہے۔ جب وہ کم ہو رہی ہوتی ہے تو بیک وقت اس کے ساتھ ہی ایک اور نصب العین کے اصلی یا فرضی حسن کا انکشاف عمل میں آ رہا ہوتا ہے اور فرد کا عمل بھی اُسی انکشاف کی نسبت سے اُس نصب العین کی طرف منتقل ہو رہا ہوتا ہے۔ اگر ایسا انکشاف عمل میں نہ آ رہا ہو تو پھر فرد ان وجوہات کی بنا پر جن کی تشریح اُوپر کی گئی بنے ایک المناک ذہنی تجزّ میں سے گزر رہا ہوتا ہے جو ایک اعصابی خلل یا صدمہ یا کم از کم ایک ذہنی پریشانی کی صورت میں ہوتا ہے۔

چونکہ نصب العین کی محبّت کے جذبہ کی رکاوٹ یا مایوسی کی حالت ایک انسان کے لیے المناک اور ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ انسان کوشش کرتا ہے کہ اس حالت کو کسی قیمت پر پیدا نہ

ہونے دے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے نصب العین کے خلاف کوئی معقول دلائل بھی سننے کیلئے تیار نہیں ہوتا اور یہ چاہتا ہے کہ ہر حالت میں اپنے نصب العین کے ساتھ چمٹا رہے اور اس بات کی بھی پرواہ نہیں کرتا کہ لوگ بجا طور پر یہ کہیں گے کہ وہ ضدی اور نامعقول ہے۔

اس کے برعکس اگر نصب العین کی محبت ترقی کر رہی ہو تو پھر یہ اپنے معمول اور قدرتی راستہ پر ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان کو کوئی تکلیف یا زحمت نہیں ہوتی۔ جب تک ایک نصب العین کی محبت کسی دوسرے نصب العین کی محبت سے نہیں ٹکراتی وہ برابر ترقی کرتی رہتی ہے اور جب ٹکراتی ہے تو بالعموم مغلوب ہو کر مٹ جاتی ہے اور دوسرے نصب العین کی محبت اس کی جگہ لے لیتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت اظہار کا تقاضا کرتی ہے اور جب عاشق کسی قدر اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے تو وہ گویا اسے اجازت دیتا ہے کہ وہ اس کے قوائے فکر و عمل کو اور لہٰذا اس کی پوری شخصیت کو ذرا اور اپنے تصرف میں لے لے۔ محبت کا ہر اظہار خواہ وہ خیال میں ہو یا لفظ میں یا عمل میں انسان کے ذخیرۂ محبت کا ایک اور جزو اس کے شعور کی گہرائیوں سے نکال کر اس کے نصب العین کے ساتھ پیوست کر دیتا ہے اور اس طرح سے نصب العین کی محبت کو ترقی دیتا ہے

بقیہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ

الٰہیات کا ذوق رکھنے والے ہوں گے، ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلل تنقید کریں۔ اور جدید علم الکلام کی بنیاد رکھیں۔ اور جو عمرانیات کے مختلف شعبوں کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام کی رہنمائی و ہدایت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں۔

بقیہ : ھدایت القرآن

ادھر حکومت سب سے زیادہ ڈرپوک ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات سے خوف کھاتی اور سایہ کو سانپ سمجھتی ہے۔ فرعون جس طرح چاہتے بنی اسرائیل کو ستاتے اور خدمت گاری میں لگائے رکھتے تھے۔ لیکن اس اندیشہ سے کہ کہیں آگے چل کر وہ عزت کا مقام نہ حاصل کرلیں اور حکومت پر قبضہ نہ کرلیں۔ اُن کے لڑکوں کو زندگی سے محروم کر دیتے اور عورتوں کو اپنی خدمت کے لیے زندگی کی سہولت دیتے۔ آیت میں اسی آزمائش کی طرف اشارہ ہے جس سے اللہ نے ان کو نجات دی تھی۔

(جاری ہے)

منہجِ انقلابِ نبویؐ

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی انقلاب کی

جدوجہد کے رہنما خطوط

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لیکر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسکی بین الاقوامی توسیع تک

اسلامی انقلاب کے مراحل مدارج اور لوازم

پر مشتمل

ماہنامہ "میثاق" میں شائع شدہ

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دس خطبات کا مجموعہ

قیمت : -/۲۰ روپے صفحات : ۳۷۵ (نیوز پرنٹ)

ملنے کا پتہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶ ماڈل ٹاؤن لاہور

مرکزی انجمن کی سالانہ رپورٹ

(بابت سال ۱۹۸۶ء)

مرتّب: لطف الرحمٰن خان

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا پندرہواں سالانہ اجلاس عام ۱۷ اپریل ۸۷ء کو ۲۶۔ کے ماڈل ٹاؤن میں منعقد ہوا۔ اس میں جناب اقتدار احمد صاحب، ناظم مکتبہ و نشر و اشاعت نے ۱۹۸۶ء کے دوران انجمن کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا۔ یہاں پر ہم اس کا اقتباس پیش کر رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جو اراکین اجلاس میں شریک نہ ہو سکے اور خاص طور سے دوسرے شہروں کے رہنے والے وابستگانِ انجمن، مرکزی انجمن کی رفتار کار سے باخبر رہیں۔

اس سال (۱۹۸۶ء) رمضان المبارک میں تراویح کے دوران ترجمۂ قرآن کا پروگرام کراچی میں منعقد ہوا جس میں ترجمہ کے فرائض صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے سرانجام دیئے۔ لاہور میں یہ پروگرام دو جگہ منعقد ہوا۔ قرآن اکیڈمی میں ترجمہ کے فرائض جناب حافظ احمد یار صاحب نے سرانجام دیئے جو اکیڈمی کے مدرس ہیں اور جامعہ پنجاب کے سابق ہیڈ آف دی عربک ڈیپارٹمنٹ ہیں۔ تنظیم اسلامی کے صدر دفتر واقع گڑھی شاہو میں ترجمہ کے فرائض جناب ڈاکٹر عبد الخالق صاحب نے سرانجام دیئے جو قرآن اکیڈمی کے دو سالہ تدریسی کورس سے فارغ التحصیل ہیں۔ الحمد للہ تینوں پروگرام کامیاب رہے۔

۶ مئی ۱۹۸۶ء کو شہداء بالاکوٹ کی یاد میں ٹاؤن ہال میں ایک بھرپور جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انجمن نے برصغیر کی ایک عظیم تحریک کی یاد تازہ کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ قرآن کالج کی تعمیر کا آغاز کرنے کی غرض سے ۹ مئی ۸۶ء کو کالج کے پلاٹ پر ایک تقریب دعا کا انعقاد ہوا جس میں جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی صاحب نے ازراہ عنایت شرکت فرمائی اور دعا کی۔

انجمن کی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے مارچ ۱۹۸۶ء میں محاضرات قرآنی کا انعقاد

ہوا اس پروگرام کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ صدر مؤسس کی تصنیف "استحکام پاکستان" پر مختلف الخیال اصحاب علم و دانش نے اظہار خیال کیا۔ چنانچہ حسب توقع جہاں صدر مؤسس کے افکار و نظریات کی تائید و تحسین ہوئی وہاں تنقید بھی ہوئی۔ لیکن جس طرح بھرپور انداز میں اہل دانش نے اس میں حصہ لیا اس سے موضوع کے ساتھ ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح استحکام پاکستان کی ضرورت و اہمیت کو اُجاگر کرنے اور اس کا چرچا کرنے کا مقصد اس پروگرام کے ذریعہ بخوبی حاصل ہوا۔

جناب اقتدار احمد صاحب نے فرمایا کہ انجمن کے مقاصد کے حصول میں جہاں کچھ کامیابیاں ہوئی ہیں وہاں آزمائشوں اور مایوسیوں کا سامنا بھی ہوتا ہے۔ لیکن ان سے دل برداشتہ ہوئے بغیر ہم اپنے مقاصد کے حصول میں کوشاں ہیں۔ البتہ تجربات اور حالات کی روشنی میں طریق کار میں مناسب تبدیلی کرتے ہیں۔

اس سال دو سالہ تدریسی کورس میں ۲۵ طلبہ نے داخلہ لیا جس میں ۸ طلبہ مؤظف تھے اور باقی ۱۷ طلبہ غیر مؤظف تھے لیکن محسوس کیا گیا کہ جس صلاحیت کے حامل افراد کی تلاش و تربیت کے لیے اس کورس کا آغاز کیا گیا تھا، وہ افراد معقول تعداد میں نہیں مل رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس تعلیمی منصوبے میں کچھ بنیادی نوعیت کے فیصلے کئے جائیں۔ چنانچہ طے ہوا کہ سردست اس اسکیم کو بند کر دیا جائے اور کوئی متبادل اسکیم متعارف کرائی جائے۔ البتہ اب تک جو طلبہ اس کورس سے مستفید ہو چکے ہیں، ان میں سے جو لوگ علمی تحقیقی کام کرنے کے خواہشمند ہوں ان کی ہمت افزائی کی جائے گی۔ اس مقصد کے لئے لائبریری بھی قائم کر دی گئی ہے۔ یہ بات بھی زیر غور ہے کہ شام کی کلاسوں میں ایک مختصر دینی نصاب کی تعلیم کا آغاز کیا جائے۔

اس سال قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم کی تعمیر کا باضابطہ آغاز ہوا۔ اخبارات میں اشتہار دے کر ٹینڈر طلب کئے گئے۔ مطلوبہ اہلیت کی حامل فرموں میں سے سب سے کم نرخ والی فرم کو ٹھیکہ دیا گیا اور اب تعمیری کام اللہ کے فضل سے نہایت تسلی بخش رفتار سے جاری ہے۔ مکمل ہونے کے بعد غالباً یہ ملک کا واحد آڈیٹوریم ہوگا جو قرآن کی تعلیم و تعلم

کے لئے بنایا گیا ہو۔ قرآن کالج کی کلاسوں کا آغاز بھی انشاء اللہ تعالیٰ اکتوبر ۸۷ء سے ہو جائے گا۔

مکتبہ اور نشر القرآن انجمن کے اہم شعبے ہیں۔ جنکے ذریعہ ہم دعوت رجوع الی القرآن کو پاکستان اور بیرونی ممالک میں عام کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں ہمارے کتب و رسائل کی فروخت ۲ لاکھ ۷۲ ہزار روپے تھی۔ ۱۹۸۶ء میں اس بابت آڈیو اور وڈیو کیسٹ کا اضافہ کیا گیا۔ اس طرح ۱۹۸۶ء میں ہمارے کتب، رسائل اور کیسٹس کی فروخت ۵ لاکھ بیس ہزار روپے ہو گئی۔ اور اس طرح رجوع الی القرآن کی دعوت ان کتب اور کیسٹ کے ذریعے دور دراز ممالک میں بھی عام ہوئی ہے۔

تمام ایف سی کا پروگرام واپڈا آڈیٹوریم کی عدم دستیابی کے بعد چند ماہ جامع شادمان میں منعقد ہوتا رہا۔ لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اب قرآن اکیڈمی میں ہفتہ میں ایک دن بروز ہفتہ بعد نماز مغرب قرآن مجید کا سلسلہ وار درس ہوتا ہے۔ اور اس کی وڈیو کیسٹ بھی تیار ہوتی ہیں۔ تاکہ جو لوگ پروگرام میں شریک نہیں ہو سکتے وہ کیسٹ کی کاپی حاصل کر کے اپنے علم کی پیاس بجھائیں۔ اس دعوت کو عام کرنے کی غرض سے صدر مؤسس نے بیرونی ممالک کے دورے بھی کئے جن میں ابوظہبی، سعودی عرب، سیکنڈے نیویا اور امریکہ شامل ہیں۔

اکیڈمی میں بچوں کے لئے ناظرہ اور حفظ قرآن کی تعلیم بھی تسلی بخش طور پر جاری ہے۔ اور اللہ کے فضل سے اس سال تین بچوں نے حفظ مکمل کیا۔ ان میں اقتدار احمد صاحب کا بھی ایک بچہ شامل ہے جس نے بارہ سال کی عمر میں اور صرف ۱۶ ماہ کی مدت میں قرآن مجید حفظ کیا۔

مجلس منتظمہ کے اراکین نے پورے سال بھرپور تعاون کیا۔ ہر ماہ باقاعدگی سے اجلاس ہوا اور کبھی بھی کورم پورا نہ ہونے کی شکایت نہیں ہوئی۔ تمام فیصلے مکمل اتفاق رائے سے کئے گئے۔ اقتدار احمد صاحب نے فرمایا کہ اس کے لئے مجلس منتظمہ کے تمام اراکین شکریہ کے مستحق ہیں۔ لیکن انجمن کے ناظم تعمیرات جناب شاہد عبداللہ صاحب

خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں اس لئے کہ تمام سال انہوں نے تعمیرات کے ضمن میں بہت زیادہ وقت دیا ہے اور اب بھی دے رہے ہیں۔

اقتدار احمد صاحب نے فرمایا کہ قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم کی شکل میں ایک بہت عظیم منصوبہ کا ہم نے آغاز کر دیا ہے۔ محض اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسے پر ہم نے اس میں ہاتھ ڈالا ہے۔ لیکن بہرحال اراکین انجمن سے بھی تعاون مطلوب ہے۔ صرف قرآن آڈیٹوریم پر لاگت کا تخمینہ تقریباً پچاس لاکھ روپے ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ انجمن کا ہر رکن حتی المقدور اس منصوبہ میں تعاون کرے۔ انشاء اللہ یہ عمارت صرف نیک کاموں کے لیے استعمال ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے دین اور قرآن کی تعلیم اور تعلّم کا ذریعہ بنے گی۔ اور ایک بہترین صدقہ جاریہ ثابت ہوگی۔

حضرت مولینا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

اپنی تالیف **وحدتِ اُمت** میں اگر

○ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سید انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دو ایمان افروز اور سبق آموز واقعات کے سوا اور کچھ نہ لکھتے تب بھی یہ کتاب موتیوں میں تُلنے کی مستحق ہوتی

وقت کے اہم ترین موضوع پر اس بہترین اور مفید ترین کتاب کو

اب مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے شایانِ شان طور پر شائع کیا ہے۔

بڑے سائز کے ٥٢ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ھدیہ : ۴ روپے ○ علاوہ محصولڈاک

مقابل ہے آئینہ

کراچی کی آگ کو بھڑکانے میں کس کس کا — کتنا کتنا حصّہ ہے ؟

سقوطِ مشرقی پاکستان کے پندرہ برس بعد — سندھ کیوں جل رہا ہے ؟

پنجابی سندھی کشمکش — مہاجر پٹھان تصادم کیوں بن گئی ؟

کیا اِس شر میں کچھ خیر بھی ہے ؟

سیاسی محرومیوں، انتظامی بے تدبیریوں، حکمرانوں کے آمرانہ طرزِ عمل، اپنوں کی مہربانیوں اور غیروں کی سازشوں کا — بے لاگ تجزیہ

اصلاحِ احوال کی مثبت تجاویز

امیرِ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا تازہ سلسلۂ مضامین

استحکامِ پاکستان اور مسئلۂ سندھ

کتابی صورت میں دستیاب ہے

ہر دردمند پاکستانی کے لیے اِس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے

۱۴۴ صفحات، سفید آفسٹ کاغذ، قیمت صرف ۱۵/ روپے

ملنے کا پتہ : ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور- فون: ۸۵۲۶۸۳

JUNE 1987 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 6
NO. 6

مِنہجِ اِنقلابِ نبویؐ

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی انقلاب کی
جدوجہد کے رہنما خطوط

غارِحرا کی تنہائیوں سے لیکر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسکی بین الاقوامی توسیع تک

اسلامی انقلاب کے مراحل مدارج اور لوازم

پر مشتمل

ماہنامہ "میثاق" میں شائع شدہ

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دس خطبات کا مجموعہ

قیمت : -/۲۵ روپے   صفحات : ۵۰۳   (نیوز پرنٹ)

ملنے کا پتہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور